پس پردہ

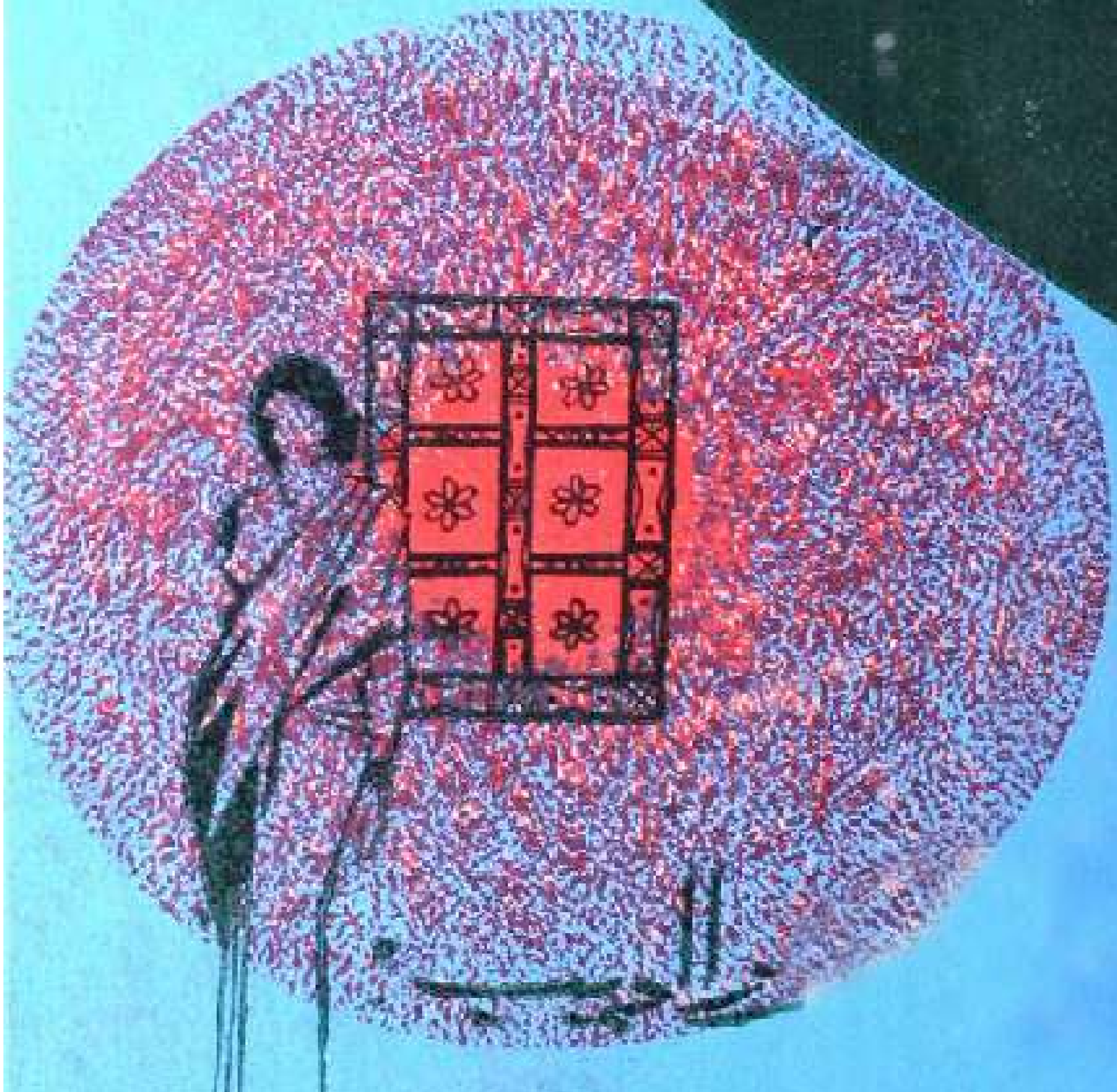

پسِ پردہ

میرزا ادیب

مکتبۂ ادب جدید

۱۵۔ پٹیالہ گراؤنڈ ، میکلوڈ روڈ ، لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف

اشاعت اول : اپریل ۱۹۶۷
ناشر : امان عاصم
قیمت : نو روپے
مہتمم : بشیر انصاری

انفائی پرنٹنگ پریس، ۱۵ — پٹیالہ گراؤنڈ، میکلوڈ روڈ، لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

آغشته ایم بر سر خارے به خونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشته ایم
(غالب)

فہرس

۱ گود ... ۱
۲ رحیلہ ... ۳۵
۳ ہمہ آفتاب است ... ۵۷
۴ کھڑکی ... ۹۹
۵ دستک ... ۱۳۵
۶ روشنی والا ... ۱۳۹
۷ شہید ... ۱۸۳
۸ دالان ... ۱۹۹

گود

کردار :-

○ صفدر
○ بیگم
○ فضل
○ بوڑھیا
○ عورت

پہلا منظر

سٹیج کسی کوٹھی کا ایک ایسا کمرہ پیش کر رہی ہے جس کا سامان ابھی بے ترتیبی سے بکھرا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سارا سامان آج ہی یہاں منتقل ہوا ہے اور اسے ترتیب کے ساتھ رکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔

ایک طرف چند کرسیاں، تپائیاں، تصویریں، لپٹا ہوا ایک قالین، پردے، گلدان اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پڑی ہیں۔

کمرے کے وسط میں ایک کوچ، پاس ایک چھوٹی میز۔

دائیں طرف کا دروازہ باہر کھلتا ہے؛ اس دروازے کو بیرونی دروازہ کہا جائے گا۔ اور دوسرا دروازہ جو بائیں دیوار میں ہے کسی اور کمرے کے سامنے واقع ہے، اندرونی دروازہ سمجھا جائے گا۔

وقت: خزاں کا ایک دن۔ تیسرا پہر شروع ہو چکا ہے۔ سامنے کمرے میں جو کھڑکی ہے اس میں دھندلی فضا کے

پیش منظر ایک درخت کا کوئی حصہ دکھائی دیتا ہے۔

پتے مسلسل گر رہے ہیں۔

سٹیج پر صرف صفدر کوچ کے پاس کھڑا ہے۔

دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ادھ جلا سگریٹ، لباس پتلون اور قمیص، عمر چالیس سال سے اوپر اور غالباً پنتالیس سے کم، چہرے پر سنجیدگی جو اس کے حقیقت پسند اور غیر جذباتی ہونے کا اظہار کر رہی ہے۔ نگاہیں سامان پر جمی ہوئی؛ شاید اس بات پر غور کر رہا ہے کہ کون سی چیز کہاں رکھی جائے گی اور کمرے کی آرائش و تزئین کس انداز میں ہوگی۔

اندرونی دروازے سے فضل آتا ہے۔ ہاتھ میں ٹرے جس میں چائے اور پلیٹ میں کچھ بسکٹ۔

فضل اندر آ کر ٹرے میز پر رکھ دیتا ہے۔

صفدر اسے آتے دیکھ کر سگرٹ فرش پر پھینک کر اسے بوٹ سے مسل دیتا ہے۔ فضل چائے کی پیالی اٹھانے لگتا ہے۔

صفدر : فضل!

فضل : (چائے کی پیالی دیتے ہوئے) ۔ جی!

صفدر : تو ــ ہاں ــ بی بی کیا کر رہی ہیں؟

فضل : صحن میں ہیں۔

(فضل بسکٹوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتا ہے)

صفدر : آج ہوا کافی تیز ہے۔

فضل : (کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے) بند کر دوں؟

صفدر : (اپنے خیال میں) صحن کی حالت تو بڑی خراب معلوم ہوتی ہے۔

(پلیٹ سے ایک بسکٹ نکال کر منہ میں ڈالتا ہے)

فضل: حالت یہ ہے میاں جی کہ ہاتھ لگاؤ تو چونا گرنے لگتا ہے۔

صفدر: شکر کرو کوئی اینٹ وینٹ نہیں گر پڑتی۔ بڑی پرانی کوٹھی ہے۔

فضل: مرمت ہوگی میاں جی!

(فضل بسکٹوں کی پلیٹ ٹرے میں رکھ دیتا ہے)

صفدر: ہوگی — ہونی چاہیے اور بہت جلد ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر تو یہاں رہنا محال ہے۔ اس کمرے کے سوا باقی سب دیواریں بڑی خراب ہیں۔

(صفدر دائیں دیوار کی طرف جاتا ہے۔ اسے غور سے دیکھتا ہے۔ بائیں ہاتھ میں پیالی تھام کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اسے چھونے لگتا ہے۔ اندرونی دروازے سے بیگم آتی ہے، عمر تیس کے لگ بھگ۔ قمیص، شلوار اور ڈوپٹے میں ملبوس، چہرے پر ملائمت جو اس کے کسی قدر جذباتی ہونے کی علامت ہے۔ ہاتھ میں پیالی)

بیگم: کیا دیکھ رہے ہیں آپ!

صفدر: (اسی حالت میں) یہ کمرہ قدرے بہتر ہے۔

بیگم: فضل دیکھنا سٹوو بند کر دیا ہے یا نہیں!

(فضل اندرونی دروازے سے جانے لگتا ہے۔ صفدر چائے کے دو گھونٹ پی کر بیوی کی طرف بڑھتا ہے)

صفدر: کوٹھی اچھی ہے، مگر مرمت کے بغیر بے کار ہے۔

بیگم: صحن والا حصہ کچھ خراب ہے۔

صفدر: وہ تو کھنڈر ہے — کھنڈر۔

بیگم : اچھی بھلی کوٹھی ہے ، کھنڈر کہاں ہے ؟

صفدر : تمہیں کھنڈر اچھا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ کیا کرتی رہی ہو صحن میں ۔

بیگم : کیا کرتی رہی ہوں ۔ آج ہوا تیز ہے نا ؟

صفدر : ہاں خزاں کی تیز ہوا چل رہی ہے !

بیگم : ہوتا یہ ہے کہ ہر پانچ منٹ کے بعد صحن پتوں سے بھر جاتا ہے ۔ تین مرتبہ صفائی کر چکی ہوں ، مگر پتے ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے ۔

صفدر : خزاں میں یہی کچھ ہوتا ہے ۔

بیگم : بے تحاشا گر رہے ہیں ۔ اب تک ہزاروں کی تعداد میں گر چکے ہوں گے ، بے چارے ۔

صفدر : کون ؟

بیگم : یہی پتے اور کون !

صفدر : پتوں کا بڑا خیال ہے تمہیں !

بیگم : سوچتی ہوں جو پتے شاخوں سے بکھر گئے ۔۔۔ وہ بچھڑ گئے ۔ اب کبھی اپنی ماں کی گود میں واپس نہیں جا سکتے ۔ جھونکے انہیں اڑا کر کہاں سے کہاں لے گئے ہیں ۔ یہ بھی ایک المیہ ہے ۔

صفدر : المیہ ہے ؟

بیگم : اور کیا !

صفدر : بہر حال اس المیے یا مسئلے پر غور کرنا ھمارا کام نہیں ھے ۔ اس کا کام ھے جس نے درخت پیدا کیے ھیں ۔ ھمارا مسئلہ اس سے مختلف ھے ۔

بیگم : ھمارا مسئلہ !

(صفدر کو یک لخت چائے کا خیال آتا ھے ۔ جلدی جلدی باقی گھونٹ پی کر پیالی ٹرے میں رکھ دیتا ھے)

صفدر : چائے کو شربت بنا کر پینا چاھتی ھو کیا ؟

بیگم : اوہ ـــ واقعی ٹھنڈی ھو گئی ھے ۔

صفدر : گرم کروا لو ـــ

بیگم : نہیں ۔

(بیگم پیالی ٹرے میں رکھ دیتی ھے)

کیا کہا آپ نے ؟

صفدر : میں اپنے مسئلے کے متعلق بات کر رھا تھا ـــ ھم نے یہ کوٹھی خریدی ھے اور اس لیے خریدی ھے کہ اس میں ھمیں رھنا ھے ۔

بیگم : ٹھیک ھے ۔

صفدر : تو اسے رھنے کے قابل بنانا کس کا کام ھے ؟

بیگم : ظاھر ھے یہ کام ھمارا ھے ۔

صفدر : تو پھر ھمیں اس مسئلے پر سوچنا چاھیے ۔ پیسے سارے کے سارے کوٹھی کے خریدنے پر اٹھ گئے ھیں مرمت کے لیے بھی معقول رقم چاھیے اور اس کا

فوراً انتظام ہونا چاہیے۔

بیگم : کیا سوچا ہے آپ نے ؟

(صفدر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتا ہے۔ سگریٹ سلگاتا ہے اور اس کے دو کش لیتا ہے)

صفدر : انتظام ہو گیا ہے !

بیگم : وہ کیسے ؟

صفدر : وہ اس طرح کہ کوٹھی نے اپنی مرمت کی ذمے داری خود لے لی ہے۔

(صفدر مسکرا کر بیوی کو دیکھتا ہے، بیوی کے چہرے پر بے جینی کے آثار نمودار ہوتے ہیں)

بیگم : کچھ سمجھ نہیں سکی۔

صفدر : جس پیڑ کے پتوں سے تم اس قدر پریشان ہو گئی ہو ـــ اسے ایک صاحب خرید رہے ہیں بلکہ خرید چکے ہیں۔

بیگم : خرید چکے ہیں !

صفدر : انہیں فرنیچر کے لئے لکڑی کی ضرورت ہے۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے اور پیڑ لگوا لیں گے۔

بیگم : (جذباتی انداز میں) ہائے زہ !

صفدر : وہ کیوں ؟

بیگم : اچھا لگتا ہے۔

صفدر : اچھا کیا لگتا ہے بڑا پرانا اور کھوکھلا درخت ہے۔

بیگم : پھر بھی !

صفدر : پھر بھی کیا ؟

بیگم : اس کی شاخوں میں ایک عجیب طلسم ہے ، ایک خاص عظمت ہے ۔

صفدر : عظمت ؟ بیگم ! اس بوڑھے درخت میں کیا عظمت ہوگی ؟

بیگم : آپ محسوس نہیں کرتے ـــ میں کرتی ہوں !

صفدر : اب اس کی عظمت دیکھیں یا کوٹھی کی مرمت کا خیال کریں ؟

بیگم : میں تو یہی کہوں گی ۔ اس کا برا نہ مانئے ۔ چند روپے نہ بھی مانیں تو کیا حرج ہے؟

صفدر : ہمارے پاس مرمت کے لئے فالتو پیسے ہیں کیا ؟

بیگم : اور کوئی انتظام نہیں ہو سکتا ؟

صفدر : جب آسانی سے انتظام ہو جائے تو دردسری کی کیا ضرورت ہے؟

بیگم : آپ ذرا اس کے نیچے جا کر دیکھیں تو سہی ! ہر طرف شاخیں پھیلی ہوئی ہیں ـــ جھکی ہوئی ہیں ۔ جیسے یہ اپنے ہاتھ آپ کی طرف بڑھا رہا ہے !

صفدر : کیا قصہ لے بیٹھی ہو بیگم ! اس آدمی نے میرے سامنے آرہ کش سے بھی کہہ دیا تھا اور وہ شاید آتا

ہی ہوگا!

بیگم: آرہ کش سے بھی کہہ دیا ہے!

صفدر: اور کیا! ۔۔۔ وقت کیا ہوگا؟

(کلائی کی گھڑی دیکھتا ہے)

اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔

بیگم: کس کو؟

صفدر: اسی آرہ کش کا ذکر کر رہا ہوں!

(بیگم خاموش رہتی ہے۔ صفدر اس کی ذہنی کیفیت محسوس کرلیتا ہے)

بیگم! اس معاملے میں خواہ مخواہ جذباتی بن رہی ہو۔ اگر تم نے خود اسے اپنے ہاتھ سے لگایا ہوتا تو بات بھی تھی۔ اب تمہارا اس سے کیا واسطہ! ۔۔۔ اچھی خاصی رقم مل رہی ہے۔ کوٹھی کی مرمت ہو جائے گی۔ ہمیں کوئی تردد نہیں کرنا پڑے گا۔

(فضل آتا ہے)

فضل: ایک بوڑھیا آئی ہے۔

صفدر: بوڑھیا؟

بیگم: بھیج دو اسے ۔۔۔ پتا نہیں کون ہے؟

(دونوں میاں بیوی بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ دروازے پر ایک بوڑھیا آئی ہے۔ شلوار اور کرتے میں ملبوس، آنکھوں پر عینک، دائیں ہاتھ میں لاٹھی، شکل سے معلوم ہوتا ہے بیمار ہے، باتیں کرتے وقت کھانستی رہے گی)

بیگم : آؤ اماں!

(بوڑھیا وہیں کھڑی رہتی ہے)

صفدر : کیا بات ہے مائی!

بوڑھیا : آپ لوگ آئے ہیں کوٹھی میں۔

صفدر : ہاں!

بیگم : اندر آجاؤ نا اماں!

بوڑھیا : اچھا ـــ مہربانی!

(بوڑھیا اندر آنے لگتی ہے)

اللہ مبارک کرے۔ جیو، پھلو، پھولو! اوہ ـــ

(بوڑھیا کھانستی ہے)

بیگم : بیٹھ جاؤ!

بوڑھیا : مہربانی!

(بوڑھیا ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

صفدر : کہاں سے آئی ہو مائی؟

بوڑھیا : یہیں سے بیٹا!

صفدر : یہیں سے کیا مطلب؟

بیگم : اماں آپ یہیں کہیں رہتی ہیں؟

بوڑھیا : ہاں پیچھے کھیتوں کے پاس جو مکان ہیں ان میں چھوٹی اینٹوں کا جو ہے ـــ اس میں رہتی ہوں۔

بیگم : اچھا اماں! آپ تو ہماری ہمسائی ہوئیں۔

صفدر : یہاں کیسے آئی ہو؟

بوڑھیا : آپ وہ پیڑ کٹوانے لگے ہیں؟

صفدر : ہاں مائی ! پاس رہنے والے لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے ۔ ان کے گھروں میں دھوپ نہیں جا سکتی ۔ سب کو بڑی شکایت ہے ۔

بوڑھیا : پہلے تو کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا تھا ۔

صفدر : ہم سے تو کہہ رہے ہیں !

بوڑھیا : اچھا (کھانستی ہے) ہائے اللہ ! ـــ کن ـــ لوگوں نے کہا ہے ۔

صفدر : جن کو تکلیف ہوتی ہے ۔

بوڑھیا : اب انہیں تکلیف ہونے لگی !

بیگم : اماں! تم چاہتی کیا ہو؟

بوڑھیا : میں تو چاہتی ہوں یہ پیڑ نہ کاٹا جائے بی بی!

بیگم : اچھا اماں! نہیں کٹوائیں گے! پر اماں! یہ تم چاہتی کیوں ہو ؟

(صفدر سگریٹ کے کش لے لے کر دیواروں کا جائزہ لینے لگتا ہے ۔ بیگم بوڑھیا سے باتیں کرے گی ۔ وہ پہلے دائیں دیوار کے پاس جائے گا اور پھر بائیں دیوار کے پاس)

بوڑھیا : کیا بتاؤں بی بی!

بیگم : تمہیں یہ پیڑ پیارا لگتا ہے؟

(بوڑھیا کھانستی ہے اور ساتھ ہی اثبات میں سر ہلانے کی کوشش بھی کرتی ہے)

بیگم : کیوں پیارا لگتا ہے؟

بوڑھیا : جب میری شادی ہوئی اور میں یہاں آئی تو یہ

ایک پودا تھا ۔

بیگم : تم یہاں آتی تھیں ؟

بوڑھیا : کیوں نہیں ۔ اس وقت اس کوٹھی میں بڑے ھی اچھے لوگ رھتے تھے ۔ میرا گھر والا ان کا باورچی تھا ۔ میں بھی ان کا کام کاج کر دیتی تھی ۔ اس باغ میں گھومتی پھرتی رھتی تھی ۔ اس زمانے میں اتنی آبادی نہیں ھوئی تھی ۔ کوٹھی اور میرے گھر کو ایک ھی راستہ جاتا تھا ۔

بیگم : تو یہ پودا تمہارے سامنے درخت بنا ؟

بوڑھیا : ھاں! وہ لوگ ولایت چلے گئے تو نئے لوگ آ گئے ۔ وہ بھی بڑے اچھے تھے ۔ میں دیر تک اس کے نیچے بیٹھ کر لوگوں کے کپڑے سیا کرتی تھی ۔

(بوڑھیا کھانستی ہے)

آس پاس جتنے لوگ رھتے ھیں ان کے بچے تو اس کے نیچے کھیلا کرتے ھیں ۔ وہ خود بھی جب بچے تھے تو یہیں کھیلتے تھے ۔

بیگم : اماں!

بوڑھیا : پتا نہیں مجھ سے کس نے کہا کہ کوٹھی والے اب پیڑ کٹوانے والے ھیں ۔ مجھے بڑا دکھ ھوا ۔ بڑی مشکل سے چل کر آئی ھوں! ۔۔۔ بیمار ھوں بی بی!

بیگم : اوھو!

بوڑھیا : بے چارا پیڑ کیا لیتا ہے کسی سے !

بیگم : کچھ نہیں اماں !

بوڑھیا : سایہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دوپہر کو جانور بھی اس کے نیچے آ جاتے ہیں ۔

بیگم : اماں ! پیڑ نہیں کٹے گا ۔

(صفدر ایک دم مڑ کر بیوی کو دیکھتا ہے ۔ بیوی اس وقت اس سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے)

بوڑھیا : اللہ تیرا بھلا کرے ، ہمیشہ سکھی رہو بی بی !

(بوڑھیا اٹھنا چاہتی ہے ۔ بیگم اسے اٹھنے میں مدد دیتی ہے)

کبھی کوئی داغ نہ لگے دل کو !

بیگم : اماں ! تو اکیلی رہتی ہے؟

بوڑھیا : اور کون رہے گا میرے ساتھ !

بیگم : کیوں؟

بوڑھیا : (لمبی آہ بھر کر) سب مر کھپ گئے ! ـــ میں بھی جا رہی ہوں ـــ تھوڑی سی رہ گئی ہے ، بیت جائے گی ـــ اچھا تم ـــ اللہ تمہیں سدا سکھی رکھے ۔

بیگم : اماں بالکل بے فکر ہو جاؤ ! پیڑ سلامت رہے گا ۔

بوڑھیا : اللہ تیری ساری مرادیں پوری ہوں ۔

(صفدر جو اس دوران میں بیوی کے پاس آ گیا ہے غور سے بیوی کو دیکھ رہا ہے ۔ بیگم بوڑھیا کو تکلیف کے ساتھ جاتے دیکھتی ہے تو ''فضل'' کو آواز دیتی ہے اور خود اس کا ہاتھ پکڑ کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

نہ نہ ـــــ یہ تکلیف نہ کر ـــــ خدا تجھے ـــــ

(بوڑھیا کا دعائیہ فقرہ کھانسی میں ڈوب جاتا ہے۔ فضل آتا ہے)

بیگم : اسے گھر چھوڑ آؤ۔

(فضل بوڑھیا کا ھاتھ پکڑ لیتا ہے ـــــ بوڑھیا جب تک دروازے سے نکل نہیں جاتی بیگم دروازے کے پاس کھڑی رہتی ہے۔ جب وہ دروازے سے نکل جاتی ہے تو لوٹتی ہے)

صفدر : اس قدر جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

بیگم : آپ نہیں سمجھ سکتے اس بےچاری کی کتنی سہانی یادیں اس سے وابستہ ھیں۔ ھم اس کی یادوں پر کلہاڑا کیوں چلائیں۔ جو چیز ھر وقت پاس رہے وہ انسان کی ساتھی بن جاتی ہے۔ کون جانے اس بوڑھیا اور درخت کا کتنا پرانا ساتھ ہے اور اب تو اس بچاری کے آخری دن ھیں۔

صفدر : مگر ھمارا مسئلہ؟

بیگم : کوئی اور انتظام نہیں ھو سکتا۔ آپ تو اس طرح باتیں کرتے ھیں جیسے یہ کوئی بڑا کٹھن مسئلہ ہے۔ معمولی سی بات ہے۔ ھو جائیگا کوئی نہ کوئی انتظام۔

(بیگم یہ فقرہ کہہ رہی ہے اور پردہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہے)

دوسرا منظر

یہ منظر پہلے منظر سے چند دن بعد وقوع پذیر ھوتا ہے۔ وھی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ سامان ابھی

تک اسی بے ترتیبی سے پڑا ہے ۔ رات کا پہلا پہر ہے ۔ سامنے کی کھڑکی بند ہے، مگر تیز و تند ہوا کا شور سنائی دے رہا ہے ۔

صفدر کرسی میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا ہے ۔ بیگم اس سے کچھ دور کرسی میں بیٹھی ہے اور کسی کتاب کے ورق الٹ رہی ہے ۔ مطالعے میں دل نہیں لگ رہا ۔

صفدر دیواروں کا جائزہ لے رہا ہے ۔

صفدر : تو اب کیا صورت بنے گی؟

بیگم : بن جائے گی ۔

صفدر : (انگلی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے) کس طرح بن جائے گی ، درخت بک نہیں سکتا اور قرض کوئی دیتا نہیں ۔

بیگم : ابھی دو ہی گھروں سے تو مانگا ہے ۔ صبح خالہ جان سے پوچھوں گی ۔

صفدر : مل جائے گی رقم؟

بیگم : ضرور مل جائے گی ۔

صفدر : کوٹھی ٹھیک ٹھاک ہو ۔ سامان قرینے سے لگایا جائے تو رہنے میں لطف بھی آئے ۔ اب کیا ہے ، مسافروں کی طرح پڑے ہیں ۔

(صفدر اندرونی دروازے کا رخ کرکے فضل کو آواز دیتا ہے)

فضل : (کسی قدر زور سے) جی آیا!

صفدر : ایک کپ چائے پی کر سو رہوں گا ۔

بیگم : کھانا نہیں کھائیں گے؟

صفدر : غنودگی سی طاری ہے ۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی ہے ۔

بیگم : سو رہیں پھر !

صفدر : ارادہ تو یہی ہے! بڑا بور موسم ہے ، اتنی تیز ہوا ۔ اتنا شور ۔۔۔

(فضل آتا ہے)

دیکھو فضل ۔۔۔ چائے بنا دو جلدی سے !

فضل : میاں جی!

صفدر : کیا ہے؟

فضل : کوئی آدھر چل رہا ہے ۔

صفدر اور بیگم : (ایک ساتھ) کہاں؟

فضل : درخت کے نیچے!

صفدر : درخت کے نیچے؟

فضل : جی ہاں باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھا ہے میں نے !

بیگم : تمہارا وہم ہوگا ۔

صفدر : اور کیا!

بیگم : جاؤ چائے بناؤ ۔

صفدر : (کچھ سوچ کر) کہاں دیکھا ہے تم نے ؟

فضل : (کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے) آدھر!

(صفدر سامنے کی دیوار کی طرف جاتا ہے ۔ کھڑکی کھولتا ہے ۔ باہر دیکھنے لگتا ہے ۔ شور بڑھ جاتا ہے ۔ بیگم اور

فضل بھی ادھر بڑھتے ھیں)

بیگم : کوئی ھے !

(صفدر کھڑکی سے ھٹ کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگتا ھے)

کہاں چلے؟

صفدر : کوئی ھے ضرور !

(صفدر تیزی سے باھر نکل جاتا ھے اس کے پیچھے فضل بھی چلا جاتا ھے ۔ بیگم دروازے کی طرف جانا چاھتی ھے ۔ دروازے کے قریب پہنچتی ھے ۔ پھر رک جاتی ھے اور کھڑکی کی طرف جاتی ھے ۔ کھڑکی میں سے باھر دیکھتی ھے ۔

تیز و تند ھوا کا شور مسلسل ھو رھا ھے ۔

بیگم چند لمحے ادھر دیکھتی رھتی ھے)

صفدر کی باھر سے آواز آتی ھے ''چلو ، اندر چلو—چلو !''

بیگم دروازے کی طرف جانے لگتی ھے ۔

صفدر کی پھر آواز آتی ھے ''میں کہتا ھوں چلو ۔'' بیگم دروازے سے باھر نکلتی ھے ۔

اب سٹیج چند لمحوں کے لئے خالی رھے گی ۔

سب سے پہلے صفدر آئے گا ۔ پھر ایک عورت ۔ اس کے پیچھے بیگم اور آخر میں فضل ۔

عورت بڑی پریشان دکھائی دیتی ھے ۔

لباس ۔ شلوار ، قمیص اور اوپر چادر بادامی رنگ کی ، چہرے سے عمر تئیس چوبیس کے قریب معلوم ھوتی ھے ۔

صفدر عورت کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رھا ھے

صفدر : اب کہو !

عورت : کیا کہوں؟

صفدر : کون ھو تم ؟

عورت : میں ـــ آپ دیکھ نہیں رہے مجھے!

صفدر : میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک چور ہو۔

(عورت کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوتے ہیں جنہیں صفدر محسوس نہیں کرتا، بیگم محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ جب وہ بولے گی تو اس کا لہجہ نرم ہوگا)

بیگم : (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھ جائیے!

(عورت بدستور کھڑی رہتی ہے)

عورت : میں چور نہیں ہوں!

صفدر : تو ادھر تمہارا کیا کام؟

عورت : گزر رہی تھی!

صفدر : یہ کوئی گزرگاہ نہیں ہے!

عورت : تو ـــ تو پھر کیا ہے؟

صفدر : بڑی چالاک بنتی ہو۔ اس طرح دھوکا نہیں دے سکتیں تم! سنا!

عورت : یہ راستا ہی تو ہے۔

بیگم : راستا تو ضرور ہے مگر عام گزرگاہ نہیں ہے۔

عورت : اچھا!

صفدر : گویا تمہیں خبر ہی نہیں تھی! کیسا بھولاپن ہے۔

عورت : میں نے اسے راستا ہی سمجھا تھا۔

بیگم : جانا کہاں چاہتی تھیں۔

عورت : (ہاتھ کے اشارے سے) ادھر۔

بیگم : ادھر کون ہے؟

عورت : ادھر ایک گھر ہے ؟

بیگم : کون ہے اس گھر میں ؟

صفدر : اگر تمہیں کہیں جانا تھا تو کوٹھی کے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی ؟

عورت : سچ میں کوٹھی کے اندر نہیں آئی ۔

صفدر : فضل کھڑکی بند کر دے !

فضل : اچھا میاں جی !

(فضل کھڑکی بند کر دیتا ہے ۔ شور تھم جاتا ہے)

بیگم : آپ نے اسے کہاں دیکھا تھا ؟

صفدر : درخت کے پاس !

بیگم : (عورت سے) تمہارا کوئی عزیز رہتا ہے یہاں ؟

عورت : ہاں ۔

بیگم : کتنی مدت بعد آئی ہو ادھر ؟

عورت : بڑی مدت بعد !

بیگم : تم غلط فہمی سے تو ادھر نہیں آ گئیں ۔

صفدر : کیا بات کہہ رہی ہو بیگم ! غلط فہمی کیسی ؟ کسی خاص نیت سے ادھر آئی ہے ۔ سوچا ہوگا موسم بہت خراب ہے آسانی سے موقع مل جائے گا ۔ کچھ نہ کچھ لے کر چمپت ہو جاؤں گی ۔

(عورت کے چہرے پر کرب کے آثار گہرے ہو جاتے ہیں)

عورت : نہیں ـــــ ہرگز نہیں ۔

(عورت یہ الفاظ اس انداز اور جذباتی شدت کے عالم میں کہتی ہے کہ تینوں ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

بیگم : (شوہر سے) آپ کو معلوم ہے آبادی سے پہلے یہاں سے گزرنے کے لیے صرف ایک راستا تھا ۔

(صفدر بیوی کی طرف گھور کر دیکھتا ہے)

صفدر : درست ہے ۔

بیگم : اب راستے الگ ہوگئے ہیں ۔

صفدر : وہ تو نہ جانے کب کی پرانی بات ہے ۔

بیگم : یہ بھی تو بڑی مدت کے بعد آئی ہے ۔

صفدر : مدت کے بعد آئی ہے صدیوں کے بعد تو نہیں آئی ۔

بیگم : اسے معلوم نہیں کہ پرانا راستا بند ہو گیا ہے ۔

صفدر : جی ہاں بچی جو ہے ۔

بیگم : میں سمجھتی ہوں یہی بات ہے (عورت سے مخاطب ہو کر) بیٹھ جاؤ ۔

(عورت اس انداز میں کھڑی ہے جیسے گفتگو اس کے بارے میں نہیں ہو رہی کسی اور کے بارے میں ہو رہی ہے ۔ کرسی میں بیٹھتی بھی نہیں)

صفدر : مصیبت یہ ہے تم ہر معاملے میں جذباتی ہو جاتی ہو ۔

بیگم : فضل !

(فضل جو خاموش تماشائی ہے ، اپنا نام سن کر چونک سا پڑتا ہے)

فضل : جی !

بیگم : چائے بناؤ !

فضل : اچھا جی !

(فضل اندرونی کمرے کی طرف جانے لگتا ہے)

بیگم : میں نے کہا آپ کی طبیعت خراب ہے ، آرام کریں ۔

صفدر : مگر۔۔

بیگم : میں نپٹ لوں گی ، آپ اطمینان کے ساتھ لیٹ جائیں جا کر ۔

(صفدر وہیں کھڑا رہتا ہے)

فکر کی کوئی بات نہیں !

(صفدر اس انداز سے بیوی کو دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو مجھے تمہاری یہ حرکت ناپسند ہے ۔ لیکن اندرونی دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتا ہے)

(اب سٹیج پر بیگم اور عورت نظر آتی ہیں)

تشریف رکھیے !

(عورت بیگم کے ان الفاظ پر حیران رہ جاتی ہے)

عورت : کیا فرمایا ؟

بیگم : میں نے یہ کہا ہے بہن ! کرسی میں بیٹھ جائیں !

عورت : مجھے جانے دیجیے ۔

بیگم : آخر آپ کو جانا ہی ہوگا ۔ کچھ دیر بعد سہی ۔

عورت : میں چور نہیں ہوں ۔

بیگم : میں جانتی ہوں آپ چور نہیں ہیں ۔

عورت : پھر آپ مجھے کیوں روک رہی ہیں ؟

GHALIB INSTITUTE,
NEW DELHI-2.

بیگم : کیونکہ آپ چور نہیں ہیں ! اگر آپ وہ ہوتیں جو میرا شوہر آپ کو سمجھ رہا ہے تو کم از کم میں آپ کو ہرگز نہ روکتی اور یہ معاملہ میرے شوہر ہی کے ہاتھ میں ہوتا ۔ میں آپ کو چور کی بجائے ایک دکھی عورت سمجھ رہی ہوں اس لیے اب آپ کی ذات کا تعلق صرف میری ذات سے ہے ۔ میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں آپ کچھ اور سمجھتی ہوں تو آپ جانیں ۔

عورت : آپ کا شکریہ !

بیگم : صرف لفظی ؟

عورت : میں کچھ سمجھی نہیں ۔

بیگم : (مسکرا کر) عملی طور پر شکریہ ادا کریں ۔

عورت : وہ کس طرح ؟

بیگم : سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ اس کرسی میں بیٹھ جائیں ۔

عورت : اگر اطمینان کے ساتھ بیٹھ سکتی تو ضرور بیٹھ جاتی ۔

بیگم : آپ بیٹھیے تو سہی !

(بیگم عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے کرسی میں بٹھاتی ہے)

اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھ پر اعتماد کریں ۔

عورت : اعتماد کیسا ؟

بیگم : مجھے آپ سے ہمدردی ہے ۔

عورت : مہربانی !

بیگم : میں آپ کو نہیں جانتی ۔ آپ بھی مجھے بالکل نہیں جانتیں ۔ پھر بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ایک دوسرے کو بتائیں کہ ہم کیا ہیں ۔ میری ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو ۔ ہم نے چند دن ہوئے یہ کوٹھی خریدی ہے ، یہاں رہنے کا ارادہ ہے ۔ ان باتوں سے بھلا آپ کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟

عورت : اور میری باتوں سے ـــــ

بیگم : مجھے دلچسپی ہے ۔

عورت : مجھے جانے دیجئے ۔ شکریہ بہت بہت ۔

(عورت کرسی سے اٹھ بیٹھتی ہے)

بیگم : آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہیں !

عورت : اعتماد کا کیا سوال ہے ؟ ـــــ آپ نے جب اندازہ لگا لیا ہے کہ میں چور نہیں ہوں ۔ پھر مجھے کیوں روک رہی ہیں ؟

بیگم : اس کی وجہ تو بتا دی ہے میں نے !

(فضل چائے کی ٹرے لے کر آتا ہے اور اسے تپائی پر رکھ دیتا ہے)

میاں صاحب کیا کر رہے ہیں فضل ؟

فضل : صوفے پر لیٹے ہیں !

بیگم : چائے دے دی انہیں ؟

فضل : جی ھاں !

بیگم : ھمیں کچھ بسکٹ وسکٹ بھی دے جاؤ ۔

فضل : بہتر !

(فضل کمرے سے نکل جاتا ھے ۔ بیگم چائے بنانے لگتی ھے)

بیگم : سچ مانو مجھے تم سے ھمدردی ھے ۔

عورت : ھمدردی ھے تو مجھے مت روکیں ۔

بیگم : جانا کہاں ھے تمہیں ؟

عورت : گھر !

بیگم : کس کے گھر ؟

عورت : کس کے گھر ؟ــــــ اپنے گھر !

(بیگم اسے چونک کر دیکھتی ھے اور چائے بنا کر اس کی طرف بڑھاتی ھے)

بیگم : لو بہن !

(عورت پیالی لے لیتی ھے ۔ فضل ایک پلیٹ میں چند ٹکڑے پیسٹری کے اور کچھ بسکٹ لے کر آتا ھے ۔ بیگم پلیٹ تپائی پر رکھ کر تپائی عورت کی طرف بڑھاتی ھے)

یہ بھی لیجئے !ـــ۔لیجئے نا !

(عورت ھاتھ بڑھا کر ایک بسکٹ لے لیتی ھے ۔ فضل چلا جاتا ھے)

عورت : شکریہ !

بیگم : آپ اپنے گھر جا رھی ھیں ؟

عورت : ہاں !

بیگم : اگر میں کہوں ، لوگ اس طرح تو اپنے گھروں کو نہیں جایا کرتے ، جس طرح آپ جا رہی ہیں تو شاید آپ کو اعتراض ہوگا۔

عورت : نہیں!

بیگم : اعتراض نہیں ہوگا ؟

عورت : مجھے کسی بات پر بھی اعتراض نہیں ہے ۔

بیگم : آپ نے خود ہی کہا تھا نا کہ ایک مدت کے بعد اپنے گھر جا رہی ہوں!

عورت : کہا تھا !

(عورت نے ابھی تک پیالی اپنے ہونٹوں سے نہیں لگائی)

بیگم : چائے پی لیجئے

عورت : اوہ۔۔۔

(عورت آہستہ آہستہ چائے پینے لگتی ہے)

بیگم : اپنے گھر جا رہی ہیں نا؟

(عورت اثبات میں سر ہلاتی ہے)

وہاں کون ہے ؟

عورت : میری ماں!

بیگم : صرف ماں؟

عورت : ہاں !

بیگم : کیا اسے معلوم ہے آپ آ رہی ہیں؟

عورت : نہیں !

بیگم : نہیں ـــ پھر بھی وہ خوش نصیب ہے کہ اس کی بیٹی
آخر لوٹ آئی ۔

عورت : خوش نصیب ؟

بیگم : کیوں ، خوش نصیب کیوں نہیں ؟
کون ہے وہ ؟

(عورت پیالی پر نظریں گاڑ کر ایک لمبی آہ بھرتی ہے)

عورت : میری ماں !

بیگم : آپ کی ماں ـــ کون؟ ـــ کہاں رہتی ہے؟

عورت : اس کوٹھی کے پیچھے !

بیگم : (کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) ابھی تک
میں نے صرف ایک بوڑھی عورت کو دیکھا ہے ۔
(بیگم عورت کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتی ہے)
آپ کے خد و خال اس کے خد و خال سے ملتے ہیں ۔
شاید وہی آپ کی ماں ہے ۔

عورت : آپ جانتی ہیں اسے؟

بیگم : نہیں جانتی نہیں ہوں ۔ فقط ایک بار دیکھا ہے ۔ ہم
وہ درخت کٹوانا چاہتے تھے ۔

عورت : کونسا درخت ؟

بیگم : وہی درخت جس کے پاس سے آپ گزر رہی تھیں ـــ
بوڑھیا بےتاب ہو کر چلی آئی تھی ۔ کہتی تھی اسے مت

کٹواؤ — یقیناً اس کے ساتھ اس کی نہ جانے کتنی پرانی اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔

عورت : میں اس پیڑ کے نیچے کھیلا کرتی تھی۔

بیگم : اس پیڑ کے نیچے؟

عورت : اس کے بازوؤں میں رات دن جھولا جھولتی تھی۔ میری معصوم خوشیوں کی ننھی سی دنیا اس کے سائے میں آباد تھی!

بیگم : جب تو آپ کو اس سے بڑا پیار ہوگا۔

عورت : اسے مجھ سے زیادہ پیار تھا۔ اس کی ہر شاخ جیسے مجھے دیکھ کر مسکرا پڑتی تھی — اس کا ہر پتا گویا مجھ پر نچھاور ہونے لگتا تھا!

بیگم : پھر کیا ہوا؟

عورت : پھر کیا ہوا؟

بیگم : کیا ہوا بہن؟

عورت : میری خوشیوں بھری دنیا جل کر راکھ ہوگئی۔

بیگم : خدا کی پناہ!

عورت : سمجھتی تھی میری خوشیاں مجھ سے کبھی نہیں بچھڑیں گی۔ میری پیاری ماں — میرا پیارا گھر اور میرا پیارا پیڑ — سب کچھ سلامت رہے گا۔ سب کچھ سلامت رہا — پر یہ میں ہی بد نصیب چلی گئی!

بیگم : کہاں؟

عورت : باپ کے مرنے کے بعد ماں نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی ۔ جہاں چاہتی تھی کھیلنے کے لئے چلی جاتی تھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی !ــــ وہ دن خزاں کا ایک منحوس دن تھا ۔ پیڑ سے پتے بے تحاشا گر رہے تھے ۔ میں اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی کہ یکایک مجھے خیال آیا کہ اس میدان میں چلی جاؤں جہاں شہر بھر کے بچے کھیلا کرتے تھے ۔ یہ سوچا اور نیچے کود پڑی ۔ اب سمجھتی ہوں کہ پیڑ بار بار میرے راستے میں سینکڑوں پتے کیوں بکھیر دیتا تھا ۔ وہ مجھے جانے سے روک رہا تھا ۔

بیگم : اس کی محبت کا یہی تقاضا تھا ۔

عورت : میں چلی گئی ــــ میدان میں پہنچ گئی اُس وقت بہت کم بچے آئے تھے اور جو آئے تھے وہ بھی جارہے تھے ۔

بیگم : اور آپ ؟

عورت : میں وہیں کھیلتی رہی ۔ آخر میری وہ سہیلی بھی جانے لگی جس کے ساتھ میں کھیل رہی تھی ۔ میں اُسے اُس کے گھر چھوڑنے چلی گئی ۔ کافی دور تھا اُس کا گھر!

بیگم : تو تنہا واپس آنے لگیں ۔

عورت : میں اکیلی تھی راستا ویران اور غیر آباد !ــــ

یکایک ایک طرف دو گھورتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں ۔ یہ آنکھیں میرے قریب آنے لگیں ـــ بالکل قریب آ گئیں ۔ پھر میں نہیں جانتی کیا ہوا ؟ ـــ جب ہوش آیا تو ایک عجیب ماحول میں پہنچ گئی تھی ۔

بیگم : اوہو !

عورت : عجیب ماحول ، اجنبی لوگ ۔ اس وسیع اور پھیلی ہوئی دنیا میں بالکل تنہا تھی ۔ وہ لوگ مجھے ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے گئے ـــ پھر تیسرے شہر میں ـــ میں اپنے گھر سے دور ہوتی چلی گئی ۔ حالات کی لہریں مجھے بہا کر کہاں سے کہاں لئے جا رہی تھیں ـــ اور میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی ! ـــ اور وقت گزر رہا تھا ۔ گزرتا چلا جا رہا تھا مجھے کبھی آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی ـــ اور جب آزادی ملی تو مجھے محسوس ہوا کہ جس رات مجھے اغوا کیا گیا ۔ اس کی ساری سیاہی میرے چہرے پر جم کر رہ گئی ہے ۔ میری ماں نے مجھے ایک معصوم بچی کے روپ میں دیکھا تھا اور اب وہ بچی ـــ

بیگم : آپ بے گناہ تھیں ۔

عورت : جب سوچتی تھی کہ اب کیا منہ لے کر جاؤں گی اپنی ماں کے پاس ـــ اب کن ہاتھوں سے اپنے گھر کے

دروازے پر دستک دوں گی ۔ اب کس زبان سے ماں کو امی کہوں گی ـــ تو ـــ

(عورت شدت جذبات میں خاموش ہو جاتی ہے)

بیگم : آپ کو لوٹ آنا چاہئے تھا ۔ ماں آخری سانس تک ماں ہی رہتی ہے ـــ اس کے گھر کا دروازہ اپنی اولاد پر کبھی بند نہیں ہو سکتا ۔

عورت : میں نے اپنے ماضی کو بھول جانے کی کوشش کی ۔ میں نے چاہا کہ میری بچپن کی زندگی سے کٹ جائے اور شائد میں کامیاب بھی ہوگئی تھی ۔

بیگم : نہیں ـــ آپ کامیاب نہیں ہوئی تھیں ۔

عورت : کئی سال گزر گئے ـــ اور میں اپنی حالت پر مطمئن سی ہوگئی ! ـــ شاید یہ ایک فریب تھا ؟

بیگم : یقیناً !

عورت : اور چند روز ہوئے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے کوئی دور سے بلا رہا ہے ـــ ایک آواز ہر لمحہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے ۔ ایک ایسی آواز جو کہہ رہی ہے ـــ آ جاؤ ـــ لوٹ آؤ ـــ لوٹ آؤ !

(عورت خاموش ہو جاتی ہے)

بیگم : اور آپ آ گئیں !

عورت : میں بہت تھک چکی ہوں ـــ بہت لمبا سفر طے کیا ہے میں نے ۔ میرا عضو عضو نڈھال ہو چکا ہے ـــ

میرے پاؤں میں چھالے پڑ چکے ہیں ــــ مجھے وہ میٹھی نیند چاہئے جو ماں کی پیار بھری گود ہی دے سکتی ہے ــــ جو ماں کے پرشفقت بازو ہی دے سکتے ہیں ــ

بیگم : یہ نیند آپ کو مل جائے گی !

عورت : مل جائے گی؟

بیگم : کیوں نہیں ملے گی ــــ ملے گی اور ضرور ملے گی !

عورت : وہ اپنی بدنصیب بیٹی کو دیکھ کر کیا کہے گی؟

بیگم : وہی جو ایک ماں اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کو دوبارہ دیکھ کر کہہ سکتی ہے ۔

عورت : وہ ــ

بیگم : ہاں وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ مر کھپ گئی ؟ اور اب جب آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے گی تو اس کی رگ رگ میں خوشیوں کا طوفان برپا ہو جائے گا ۔

عورت : (آٹھ کر) سچ ؟

بیگم : اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا !

(بیگم عورت کے بازو پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

جائیے بہن جائیے ۔ اس دروازے پر دستک دیجئے جس کے پیچھے دو بوڑھی آنکھیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں ــ جہاں آپ کے لئے پیار ہے ــ سکون ہے ــ میٹھی نیند ہے ! جائیے ۔

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں)

آپ کی بچھڑی ھوئی خوشیاں آپ کو واپس مل رھی ھیں !

(عورت اس کا کوئی جواب نہیں دیتی ۔ بیرونی دروازے کی طرف جانے لگتی ھے)

خدا حافظ !

(عورت دروازے میں سے نکل جاتی ھے)

(اب سٹیج پر بیگم اکیلی ھے ۔ اس کی ھر حرکت سے معلوم ھوگا کہ وہ بہت مضطرب ھے ۔

عورت کے جانے کے دو تین لمحوں کے بعد خود بھی دروازے سے باھر جاتی ھے اور پھر واپس آ جاتی ھے ۔ کمرے میں دو تین چکر لگاتی ھے ۔

سامنے جا کر کھڑکی کھول دیتی ھے ۔ تیز و تند ھوا کا شور طوفانی صورت اختیار کر لیتا ھے ۔

وہ کھڑکی میں کھڑی ھو جاتی ھے ــ پھر اسے کھلا چھوڑ کر اندرونی دروازے میں جاتی ھے اور آواز دیتی ھے ''فضل'' ــ فضل کی دور سے ''جی'' کہتی ھوئی آواز سنائی دیتی ھے ــ بیگم واپس آتی ھے ۔ فضل آتا ھے)

بیگم : میاں جی سو گئے؟

فضل : جی ھاں ــ صوفے پر ھی سو گئے ھیں ۔

بیگم : تم بھی سو جاؤ جا کر !

فضل : بی بی جی ! ــ وہ چلی گئی ۔

بیگم : اپنی ماں کے پاس ــ وہ جو بوڑھیا آئی تھی نا ــ وھی اس کی ماں ھے ۔

فضل : وہ بوڑھیا جس نے کہا تھا پیڑ نہ کاٹو ــ وہ تو بے چاری کل صبح مر گئی تھی بی بی جی ۔

بیگم : مر گئی تھی؟ ـــــ اوہ میرے اللہ ! میرے اللہ !!

فضل : میں ادھر سے گزرا تھا تو دیکھا تھا ۔

بیگم : (لہجے میں انتہائی قلق) ماں مر گئی تو ـــ

(فضل چائے کے برتن اٹھانے لگتا ہے یکایک بڑے زور سے دھماکہ ہوتا ہے ۔ فضل کے ہاتھ سے ٹرے گر پڑتی ہے ۔ برتن فرش پر گر کر ٹوٹ جاتے ہیں ۔

بیگم کے منہ سے چیخ نکلتی ہے ۔ فضل ایک دم پکارتا ہے "بی بی جی"۔

صفدر بھاگتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے "کیا ہوا" ۔ یہ سب کچھ ایک ساتھ ہو گا !

فضل کھڑکی کی طرف جاتا ہے ۔ باہر دیکھتا ہے)

فضل : میاں جی ! پیڑ گر پڑا ۔

صفدر اور بیگم : (ایک ساتھ) پیڑ گر پڑا !

(صفدر اور فضل بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہیں اور پھر تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں ۔

ان کے تین چار لمحوں کے بعد بیگم بھی دروازے میں سے غائب ہو جاتی ہیں ۔ اب سٹیج پر کوئی نہیں ہے طوفانی ہوا کا شور مسلسل ہوتا ہے ۔

بیگم اندر آتی ہے ـــ مگر اس انداز سے کہ نگاہیں دروازے پر جمی رہتی ہیں اور پاؤں پیچھے ہٹتے جاتے ہیں ۔ تین چار قدم پیچھے ہٹ کر وہ دائیں جانب ہٹ جاتی ہے ۔ صفدر اور فضل عورت کو اٹھائے آتے ہیں)

بیگم : کیا ہوا ؟

فضل : درخت کے نیچے آ گئی ۔

(صفدر اور فضل عورت کو کوچ پر لٹا دیتے ہیں ۔ وہ لہو لہان ہے ۔ بیگم فرش پر بیٹھ کر اس پر جھک جاتی ہے)

بیگم : تم ---

عورت : میں --- گھر گئی --- پر وہاں مجھے ماں کی گود نہیں ملی ---

بیگم : اوہ ---

عورت : میں نے سمجھ لیا --- میرے مقدر میں میٹھی نیند نہیں ہے --- اور میں لوٹ چلی --- پیڑ کے پاس سے گذرنے لگی تو پتے بے تحاشا میرے پاؤں میں گرنے لگے --- اور پھر اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا --- جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو --- اپنے سینے سے لگا لیتی ہے --- اور مجھے میٹھی نیند دے دی --- میٹھی نیند --- میٹھی --- چین بھری نیند --- میٹھی نیند --- ماں کی گود میں !!!

(عورت کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں --- بیگم سسکیاں بھرتی ہوئی پیچھے ہٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے ۔
صفدر اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور غمناک آواز میں کہتا ہے ''بیگم''۔
فضل بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا ہے ۔
شور مسلسل برپا ہے اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

——:o:——

رحیلہ

کردار :-

میاں صاحب
رحیلہ
نادرہ

منظر

ایک اچھا خاصا خوبصورت اور مزین کمرہ

فرش کے اوپر دری ۔ صوفہ سیٹ نئے ڈیزائن کے ، ان کے علاوہ چند کرسیاں ، تپائیاں اور ایک گول چھوٹی میز ۔

ہر چیز قرینے اور سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی ۔

دائیں دیوار میں پیازی رنگ کے پردے کے پیچھے دروازہ ۔ سامنے جو کھڑکی ہے اس پر بھی پردہ پڑا ہے ۔ بائیں دیوار سے کچھ فاصلے پر ، لمبے صوفے کے اوپر گاؤ تکیے سے کمر لگائے میاں صاحب نیم دراز ہیں ۔ عمر پچاس سے اوپر ۔ فرنچ کٹ داڑھی ۔ آنکھوں پر عینک ، چہرے کے اثرات بتا رہے ہیں کہ ایک لمبی بیماری سے ابھی ابھی نجات پائی ہے ۔ پاجامے ، قمیص اور واسکٹ میں ملبوس ۔

صوفے کے پاس گول میز کے اوپر چند بوتلیں ، شیشے کا گلاس ، دو پیالیاں چینی کی ، تھرمامیٹر اور کچھ کاغذات ، ٹیبل لیمپ اور چارٹ ۔

میاں صاحب کے ہاتھ میں کوئی کتاب ہے ــــ اور منہ میں تھرمامیٹر ۔ کتاب ابھی پڑھتے پڑھتے چھوڑی ہے اس لئے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی کتاب کے اندر پھیلا رکھی ہے ۔ قریب رحیلہ ذرا جھکے ہوئے انداز میں کھڑی ہے وہ اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ چند لمحے اور گزر جانے کے

بعد تھرمامیٹر دیکھ کر چارٹ میں اس کا اندراج کر دے۔ نگاہیں کلائی کی گھڑی پر جمی ہیں ، بائیں ہاتھ میں فونٹین پن ہے ۔

رحیلہ ـــــ لمبے قد کی لڑکی ہے ۔ رنگ سانولا ، چہرہ لمبوترا ، نقش کھرے ، ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے ۔ ہاتھ بڑھا کر تھرمامیٹر نکالتی ہے ۔ دیکھتی ہے ۔ میز سے اس کا کور اٹھا کر تھرمامیٹر اس میں ڈالنے لگتی ہے

میاں صاحب : کیوں رحیلہ؟

رحیلہ : ٹھیک ہے ۔ ڈونٹ وری (Do'nt Worry)

(چارٹ اٹھا کر اس میں اندراج کرتی ہے ۔ چارٹ پھر وہیں رکھ دیتی ہے)

میاں صاحب : ٹمپریچر ؟

رحیلہ : ہنڈریڈ (Handred)

میاں صاحب : بخار تو ہے نا ابھی !

(رحیلہ تھرمامیٹر میز پر رکھ دیتی ہے)

رحیلہ : پہلے سے تو بہت فرق ہے ۔

میاں صاحب : یہ تو میں خود بھی محسوس کرتا ہوں ۔

رحیلہ : ذرا کمزوری ہے ، دور ہوجائے گی آہستہ آہستہ ۔ میرا خیال ہے ایک دو ویکس (Weeks) لگ جائیں گے ۔

میاں صاحب : بس !

رحیلہ : (مسکرا کر) اور کیا میاں صاحب ! کیا بستر پر ہی لیٹے رہنے کا ارادہ ہے ۔

(رحیلہ ایک بوتل اٹھاتی ہے اور اسے ہلانے لگتی ہے)

میاں صاحب : بستر پر کون لیٹتا ہے اپنی خوشی سے ۔ بیماری مجبور کرے تو کیا کرے کوئی ۔

رحیلہ : (ایک خوراک گلاس میں ڈالتی ہے) کیا کرے کوئی ـــ بس بستر پر لیٹ جائیے ۔

(میاں صاحب اور رحیلہ دونوں مسکراتے ہیں)

میاں صاحب : جیسے میں لیٹا ہوں ۔

رحیلہ : (ان کی طرف گلاس بڑھاتی ہے) لیجئے ۔

میاں صاحب : سخت کڑوی دوا ہے ۔ خدا کی پناہ ۔

رحیلہ : اسی دوا نے تو آپ کو صحت دی ہے ۔

میاں صاحب : نہیں ۔

(میاں صاحب جلدی سے خوراک پی کر گلاس رحیلہ کی طرف بڑھا دیتے ہیں ۔ بدمزگی سے ان کا چہرہ بگڑ گیا ہے ۔ رحیلہ گلاس میز پر رکھ دیتی ہے)

رحیلہ : نہیں ؟

میاں صاحب : مجھے دوا نے صحت نہیں دی ۔

رحیلہ : تو پھر کس نے دی ہے ؟

میاں صاحب : تمہاری اور نادرہ کی تیمارداری نے ۔

رحیلہ : میں نے کیا کیا ہے بھلا ؟

میاں صاحب : یہ تمہاری ہی جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ اتنی جلد صحت یاب ہوگیا ہوں ۔

رحیلہ : میں نے تو ایک نرس کا فرض ادا کیا ہے ۔

(رحیلہ کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہے ـــ ذرا مضطرب

ھوجاتی ھے۔ اضطراب اس حرکت سے ظاھر ھوتا ھے کہ وہ اپنا دائیاں ھاتھ سر کے بالوں میں پھیرنے لگتی ھے)

میاں صاحب : دنیا میں کتنے لوگ ھیں جو اپنا فرض ـــ فرض سمجھ کر ادا کرتے ھیں۔

رحیلہ : آپ نے مجھے تیمار داری ھی کے لئے تو ھسپتال سے بلایا تھا۔

میاں صاحب : میں کبھی ھسپتال میں نہیں رھا ـــ رھنا بھی نہیں چاھتا تھا۔ نادرہ نے مشورہ دیا کہ کسی نرس کو اپنے گھر پر بلا لیں تو بہتر ھوا۔ تمہیں بلایا ـــ

رحیلہ : اور میں آگئی۔

(گھڑی بھر دیکھتی ھے)

میاں صاحب : تم نے جو کچھ کیا ھے ایک نرس شاید نہیں کر سکتی ! ـــ ایک بیٹی یا بہن ھی کر سکتی ھے۔

رحیلہ : شرمندہ کررھے ھیں آپ۔ پلیز ـــ (Please)

(رحیلہ کچھ کہنا چاھتی ھے کہ میاں صاحب جلدی سے بول اٹھتے ھیں)

میاں صاحب : جو کچھ محسوس کیا ھے اسی کا اظہار کر رھا ھوں۔ تمہیں ھسپتال سے بلا لیا۔ نادرہ چند روز کے لئے اپنے گھر سے آگئی۔ میری مصیبت کے دن کٹ گئے، نہ کوئی بیٹا ھے نہ بیٹی۔ تنہائی میں نہ جانے کیا حال ھوتا۔

رحیلہ : جی ـــ خیر آپ صحت یاب ہوگئے ہیں اب تو ۔

میاں صاحب : پوری طرح !

رحیلہ ہو ہی جائیں گے ۔ چند روز ہی کی تو بات ہے ـــ اور ـــ

میاں صاحب : کہو ـــ کیا بات ہے ، خاموش کیوں ہوگئیں !

رحیلہ : جی میں شرمندہ ہوں ۔

میاں صاحب : وہ کیوں ـــ ؟

رحیلہ : اجازت چاہتی ہوں ۔

(میاں صاحب گھور کر رحیلہ کو دیکھتے ہیں ۔ وہ نگاہیں جھکا لیتی ہے)

میاں صاحب : جانا چاہتی ہو ؟

رحیلہ : جی ہاں ! ایک مجبوری ہے ۔

میاں صاحب : ہسپتال والوں نے بلایا ہے؟

رحیلہ : جی نہیں ۔

میاں صاحب : تو پھر کیا مجبوری ہے ؟

رحیلہ : ہے جی ایک مجبوری ۔ معاف کیجئے ، آپ سمجھیں گے میں تنگ آ گئی ہوں یا کوئی اور بات ہے ـــ مگر ایسا نہیں ہے ۔ آپ کا اور نادرہ بہن کا سلوک مجھے کبھی نہیں بھول سکتا ۔

میاں صاحب : میں تمہیں روکوں گا نہیں ۔ جب تک جی

چاہے یہاں رہو، جس وقت جانا ہو چلی جاؤ

رحیلہ : میں نے عرض کیا نا ۔۔ بات ہی کچھ ایسی ہے ۔

میاں صاحب : جب تم کہتی ہو تو یقیناً کوئی مجبوری ہوگی ، میری طرف سے اجازت ہے ۔

رحیلہ : تھینک یو سر ۔ (Thank you Sir)

(رحیلہ شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا خم دیتی ہے)

میاں صاحب : اچھا ذرا نادرہ کو بھیج دو ۔

رحیلہ : بہتر ۔

(رحیلہ دروازے میں سے نکل جاتی ہے ۔ میاں صاحب اس انداز سے سامنے دیکھنے لگتے ہیں جیسے یکایک کسی سوچ میں ڈوب گئے ہوں ۔
۔۔۔ نادرہ آتی ہے ۔
نادرہ ، رحیلہ کے مقابلے میں صحت مند ہے ۔ سرخ و سفید ، چہرے سے ہمدردی اور شفقت نمایاں ۔ لباس شلوار قمیص ، سوئٹر اور دوپٹہ ۔ میاں صاحب کو اس کے آنے کا علم نہیں ہوتا اپنے ہی خیال میں غرق رہتے ہیں ۔ نادرہ آگے بڑھ کر رک جاتی ہے ۔ اور بڑے غور سے میاں صاحب کو دیکھنے لگتی ہے)

نادرہ : چچا جان ۔

(میاں صاحب کو اب بھی خبر نہیں ہوتی)

میں نے کہا چچا جان ۔۔۔ چچا جان !!

(میاں صاحب چونک سے پڑتے ہیں)

میاں صاحب : اوہ تم ! کہو ۔۔۔ کیا بات ہے؟

نادرہ : نیند آ رہی ہے ؟

میاں صاحب : نہیں ۔

نادرہ : کچھ سوچ رہے تھے آپ ؟

میاں صاحب : ہاں ، کچھ یاد آ گیا تھا ـــــ اچھا دیکھو نادرہ بیٹی !

نادرہ : جی چچا جان !

میاں صاحب : رحیلہ جا رہی ہے ۔

نادرہ : رحیلہ جا رہی ہے ـــ وہ کیوں ؟

میاں صاحب : کوئی ذاتی کام ہے ـــ بتایا نہیں اس نے ۔

نادرہ : مگر چچا جان ! آپ پوری طرح صحت یاب کہاں ہوئے ہیں ؟

میاں صاحب : خیر وہ جانا چاہتی ہے تو ہم اسے کیوں روکیں ۔ یقیناً اسے کوئی ضروری کام ہوگا ۔

نادرہ : مجھ سے تو کچھ نہیں کہا اس نے ؟

میاں صاحب : مجھ سے جو کہہ دیا ہے ـــ اب اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ انعام کے طور پر اسے کچھ مزید رقم دے دینا ۔

نادرہ : یہ تو ہوگا ہی ۔ مگر میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس نے یکایک جانے کا ارادہ کیوں کر لیا ہے ؟

میاں صاحب : میں نے کہا نا ، اب اصرار کی ضرورت نہیں ۔

نادرہ : اچھا ۔

(نادرہ جانے لگتی ہے ۔ دروازے پر پہنچ کر پلٹ کر میاں صاحب پر نظر ڈالتی ہے ۔ وہ پھر اسی طرح کچھ سوچنے لگتے ہیں وہ دو تین لمحے انہیں غور سے دیکھتی رہتی ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی وہیں آ جاتی ہے ۔ میاں صاحب اسے دیکھتے ہیں)

میاں صاحب : کیوں نادرہ ! گئیں کیوں نہیں ؟

نادرہ : چچا جان !

میاں صاحب : کیوں ؟

نادرہ : آپ سوچ کیا رہے ہیں !

میاں صاحب : بے کار آدمی پرانی یادیں نہ کریدے تو اور کیا کرے ـــــ کچھ وقت اچھا گزر جاتا ہے ۔

(نادرہ میاں صاحب کو غور سے دیکھتی ہے)

نادرہ : مگر یہ کوئی خوشگوار یاد نہیں ہے ۔ آپ کچھ دکھی نظر آتے ہیں ۔

میاں صاحب : تمہارا اندازہ درست ہے ۔

(میاں صاحب نے دائیں ہاتھ میں جو کتاب پکڑ رکھی ہے اسے تکیے پر رکھ دیتے ہیں ـــــ ایک لمبی آہ بھرتے ہیں)

نادرہ بیٹی ! تمہیں معلوم ہے آج مارچ کی پندرہ ہے ۔

(نادرہ جیسے چونک سی پڑتی ہے)

نادرہ : پندرہ مارچ ؟ ـــــ ہاں چچا جان ۔

میاں صاحب : ایسی ہی سرد شام تھی وہ ـــــ سرد اور دھند بھری ۔ (ایک دو لمحے خاموش رہتے ہیں) اس

کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی ۔ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ یکایک چلا جائے گا ۔ میرے سامنے ـــ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ۔ چہرہ بے جان ہو گیا ۔ میری دنیا ـــ ہنستی بولتی دنیا ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی ۔ (میاں صاحب آنکھیں بند کر لیتے ہیں پھر کھولتے ہیں تو نادرہ کو دیکھتے ہیں) اچھا تم جاؤ ۔ رحیلہ تیار ہو چکی ہوگی ۔

نادرہ : ابھی کافی دیر ہے اس کے تیار ہونے میں ۔

میاں صاحب : پھر بھی ۔

نادرہ : چچا جان ۔ بھائی جان کی طبیعت یک لخت خراب کیوں ہو گئی تھی ؟

میاں صاحب : بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی ـــ کسے خبر تھی کہ موت دبے پاؤں اس کی طرف بڑھے چلی آ رہی ہے اور وہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے (میاں صاحب آہ بھرتے ہیں) رات کے تین بجے ہوں گے ـــ جب اس نے ”ابا“ کی نحیف آواز نکالی ـــ اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ۔ یہ منظر مجھے کبھی نہیں بھول سکتا ـــ کچھ اور بھی یاد آ جاتا ہے اس کے ساتھ ۔

(میاں صاحب خاموش ہو جاتے ہیں)

نادرہ : کیا چچا جان ؟

میاں صاحب : کچھ نہیں ۔

نادرہ : چچا جان !

میاں صحب : چھوڑو بیٹی اس بات کو ۔

نادرہ : میں جانتی ہوں آپ کو تکلیف ہوتی ہے یہ باتیں یاد کر کے ۔

(نادرہ جانے کے لیے مڑتی ہے کہ میاں صاحب کی آواز سن کر پھر رک جاتی ہے)

میاں صاحب : اس نے بتایا تھا کہ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور وہ اس کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کا آرزو مند ہے ۔ کتنی حسرت تھی اس کی آنکھوں میں ! میں آج بھی اس کی حسرت سے بھری ہوئی آنکھیں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں ـــ وہ بہت کچھ بتانا چاہتا تھا مگر موت تو گویا دروازے پر دستک دیئے جا رہی تھی ۔ لگتا ہے جیسے اس نے یہ دستک سن لی تھی ۔ کیونکہ وہ یکایک خاموش ہو گیا تھا ۔

نادرہ : وہ کون تھی ؟

میاں صاحب : (اپنے خیال میں) زندگی اور موت کے درمیان اچانک کتنی اونچی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے ۔ کتنا تھوڑا فاصلہ ہے ہستی اور عدم کے درمیان ـــ ابھی وہ زندگی کی سرحد پر باتیں کر رہا تھا اور ابھی ایک قدم چل کر موت کی سرحد پر پہنچ گیا ـــ وہ چلا گیا

———میرا بچہ———میرا لعل ، مگر جاتے ہوئے ایک حسرت دے گیا ۔ مجھے کچھ بھی تو نہ بتا سکا کہ وہ لڑکی کون ہے———میں چاہتا ہوں کہ اسے بتا دوں کہ وہ آخری سانس تک اسے یاد کرتا رہا ہے———مگر وہ لڑکی———کون جانے کہاں ہے ۔ کبھی دیکھ بھی سکوں گا اسے یا نہیں———شاید کبھی نہیں ۔ یہ دنیا بہت وسیع ہے ۔ کون کہاں ہے ۔ کون جانے———کون جان سکتا ہے ؟ (دو تین لمحے دونوں خاموش رہتے ہیں) نادرہ———!

نادرہ : جی چچا جان ۔

میاں صاحب : انعام کا خیال رکھنا ضرور———

(میاں صاحب اٹھنے لگتے ہیں)

نادرہ : آپ کدھر چلے ؟

میاں صاحب : خان صاحب کے یہاں ۔ ٹیکسی کے لیے فون کر دوں ۔

نادرہ میں کیے دیتی ہوں ۔

میاں صاحب : نہیں———وہاں تک جاتے جاتے طبیعت کچھ بہل جائے گی———لیٹے لیٹے تھک جاتا ہوں !

(میاں صاحب دروازے کی طرف جاتے ہیں ۔ نادرہ وہیں کھڑی رہتی ہے ۔ جب وہ دروازے میں سے نکل جاتے ہیں تو چارٹ اٹھا کر دیکھتی ہے———اور پھر اسے وہیں میز کے اوپر رکھ دیتی ہے ۔ دروازے کی طرف رخ کرتی ہے ابھی

اس نے دو قدم ھی اٹھائے ھیں کہ رحیلہ اندر آ جاتی ھے۔ رحیلہ نے گلابی ساڑھی زیب تن کر رکھی ھے۔ بال سنورے ھوئے۔ ھونٹوں پر لپ اسٹک دائیں ھاتھ میں پرس ـــ رحیلہ کو اندر آتے دیکھ کر نادرہ رک جاتی ھے)

نادرہ : واقعی آپ جا رھی ھیں ؟

رحیلہ : میاں صاحب نے جانے کی اجازت دے دی ھے۔

نادرہ : میں جانتی ھوں۔ انھوں نے خود مجھ سے اس بارے میں کہہ دیا ھے۔

رحیلہ : کام ھی کچھ ایسا ھے ورنہ کبھی نہ جاتی۔

نادرہ : مجبوری ھے جبھی تو جا رھی ھیں۔

رحیلہ : کیا کیا جائے ؟

نادرہ : روکا بھی نہیں جا سکتا۔ کیا خبر کتنا ضروری کام ھے۔

رحیلہ : جی ھاں ـــ (خالی صوفے کو دیکھ کر) میاں صاحب کدھر گئے ؟

نادرہ : ٹیکسی کے لیے فون کرنے گئے ھیں۔

رحیلہ : کیا ضرورت تھی اس کی ـــ ٹیکسی راستے میں لے لیتی۔ ھاں تو کچھ بتا دوں آپ کو دواؤں کے متعلق !

نادرہ : میں جانتی ھوں ! ـــ ذرا ایک تکلیف کیجئے۔

رحیلہ : فرمائیے !

نادرہ : ایک منٹ۔ (نادرہ جلدی سے دروازے میں سے نکل جاتی

ہے - اور تین چار لمحوں کے بعد آ جاتی ہے - رحیلہ اس اثنا میں دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے - نادرہ کے ہاتھ میں کچھ نوٹ ہیں) ذرا پرس دکھائیے اپنا -

رحیلہ : وہ کیوں -

نادرہ : دکھائیے تو - (نادرہ ہاتھ بڑھا کر پرس لے لیتی ہے)

رحیلہ : دیکھئے زیادتی مت کیجئے - میں سب کچھ وصول کر چکی ہوں -

نادرہ : ہماری خوشی کا بھی کچھ خیال کیجئے - (نادرہ نوٹ پرس میں ڈال کر پرس رحیلہ کی جانب بڑھاتی ہے - رحیلہ پرس لے لیتی ہے) شکریہ ! بہت بہت !

رحیلہ : بہرحال تھینک یو -

نادرہ : ایک بات اور -

رحیلہ : ابھی کوئی کسر باقی ہے ؟

نادرہ : مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں ـــــ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میرے ذہن میں ایک الجھن سی پیدا ہو گئی ہے -

رحیلہ : الجھن کیسی ؟

نادرہ : آپ اس طرح جو جا رہی ہیں -

رحیلہ : کہا نا ، مجبوری ہے -

نادرہ : مثلاً ؟

رحیلہ : یہ ایک ذاتی سا معاملہ ہے ۔

نادرہ : اسی لیے تو میں نے کہا ہے ، مجھے پوچھنے کا کوئی حق نہیں !

(رحیلہ خاموش رہتی ہے)

دیکھئے رحیلہ بہن ۔

رحیلہ : کہیے ۔

نادرہ : سوچتی ہوں رحیلہ ہسپتال سے ایک نرس بن کر آئی ۔ بہن بن کر یہاں رہی اور اب ایک معما بن کر جا رہی ہے ۔

(رحیلہ خاموش رہتی ہے)

میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا ؟

رحیلہ : کیا بتاؤں !

نادرہ : بعض معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انسان انہیں دوسروں کو نہیں بتا سکتا ۔ شاید یہ بھی ایک ایسا ہی معاملہ ہے ۔

رحیلہ : آپ نے درست کہا ہے ۔

نادرہ : خیر ـــ ٹھیک ہے ۔

رحیلہ : آپ کے ذہن میں ایک الجھن سی رہے گی ۔

نادرہ : رہے گی تو ضرور ۔

رحیلہ : مجھے اس کا افسوس ہے ۔

نادرہ : کیا کیا جائے ؟

(رحیلہ دو تین لمحے خاموشہ سے نادرہ کو دیکھتی رھتی ھے)

رحیلہ : ھر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی راز ایسا ضرور ھوتا ھے جسے وہ زبان پر نہیں لاتا ــــ اور نہ لانا چاھتا ھے ،

نلدرہ : کیونکہ ــــ یہ راز ، اس کی زندگی کا سب سے قیمتی راز ھوتا ھے ۔

رحیلہ : آج سے سات برس پہلے کی بات ھے ۔

(رحیلہ اتنا کہہ کر خاموش ھو جاتی ھے)

نادرہ : بتانے میں حرج محسوس کریں تو بالکل نہ بتائیں ۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ھوگی ۔

رحیلہ : (اپنے خیال میں) اس وقت میں نرسنگ کی ٹریننگ لے رھی تھی ــــ میرا ایک دوست تھا جو اکثر مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا ۔

نادرہ : تو ــــ

رحیلہ : ایک دن شفیق کے ھمراہ ایک نوجوان بھی آیا ــــ اس طرح آیا کہ میری زندگی میں داخل ھو گیا ۔ ملاقاتیں ھونے لگیں اور کئی دن رھیں ۔ ایک شام اس نے بتایا کہ وہ گھر جا رھا ھے اور بہت جلد لوٹ آئے گا اور جب لوٹے گا تو ایک بہت بڑی خوشخبری سنائے گا مجھے ۔

(رحیلہ جذبات کی شدت میں خاموش ہو جاتی ہے ۔ نگاہیں سامنے دیوار پر جمی ہیں اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں پرس پر دوڑ رہی ہیں)

اس نے کہا تھا —— دیکھو رحیلہ ! اس باغ میں ، اسی درخت کے نیچے میرا انتظار کرنا —— جہاں ہم نے اکثر ملاقاتیں کی ہیں ۔ میں ہر حالت میں ، ہر صورت میں یہاں پہنچ جاؤں گا ۔ چند روز میں بلکہ اس سے بھی کم وقت میں ۔

(رحیلہ ذرا خاموش ہوتی ہے)

میں اس کا انتظار کرتی رہی —— اور ——

نادرہ : اور ——

رحیلہ : اب تک کر رہی ہوں ۔

نادرہ : کہاں چلا گیا تھا وہ ؟

رحیلہ : اپنے گھر —— آپ کے اسی شہر میں ۔

نادرہ : آپ نے پوچھا ہوتا ۔

رحیلہ : ہم گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے ، مگر گھریلو باتیں کبھی ایک دوسرے کو نہ بتا سکے ۔ کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی ۔

نادرہ : اور شفیق ؟

رحیلہ : وہ انہی دنوں انگلستان چلا گیا تھا ۔ اب اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی ۔

نادرہ : آپ نے اسے ڈھونڈا ہوگا ۔

رحیلہ : میں نے کچھ مدت تک اس کا انتظار کیا ـــــ پھر یہاں آ کر ہسپتال میں نرس بن گئی کہ اس طرح اسے ڈھونڈ لوں گی ۔ مگر نہیں پا سکی اسے ۔

نادرہ : اس کا کوئی خط ؟

رحیلہ : کبھی نہیں ملا ۔

نادرہ : اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ بے وفا نکلا ـــــ

رحیلہ : دل کو یقین نہیں آتا ـــــ وہ

نادرہ : بے وفا نہیں تو پھر ملا کیوں نہیں تم سے !

رحیلہ : میں نے یہ کبھی نہیں سوچا ـــــ ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ وہ ایک دن ضرور آ جائے گا ـــــ جہاں کہیں بھی ہے آ جائے گا ۔ اسی باغ میں ـــــ اسی درخت کے نیچے ۔ جہاں ہماری خاموش نگاہوں نے ، ہمارے دل کی دھڑکنیں بن کر ہزاروں باتیں ایک دوسرے سے کہی تھیں ـــــ جہاں اس کی لمبی لمبی انگلیوں نے بارہا میرے بالوں کو چھوا تھا ـــــ جہاں بار بار میرا سر اس کے سینے سے جا لگا تھا ـــــ جہاں ـــــ

(رحیلہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے ـــــ باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے ۔ رحیلہ آنکھیں کھول دیتی ہے)

مارچ کا یہ پورا ہفتہ وہیں گزارتی ہوں ــــ ہر شام باغ میں جا کر اس کا انتظار کرتی ہوں ــــ وہ ضرور کسی دن آ جائے گا ــــ ہو سکتا ہے اسی ہفتے آ جائے ــــ پھر ــــ (رحیلہ آنکھیں جھکا لیتی ہے)

نادرہ : نام کیا تھا اس کا ؟

رحیلہ : راشد !

(رحیلہ کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں ۔ نادرہ گھور کر اسے دیکھتی ہے ۔ دروازے میں میاں صاحب آتے ہیں)

میاں صاحب : رحیلہ !

(رحیلہ اسی انداز میں کھڑی رہتی ہے ۔ نادرہ فوراً میاں صاحب کی طرف دیکھتی ہے)

نادرہ : گاڑی آ گئی چچا جان ؟

(ہارن کی آواز پھر آتی ہے ۔ رحیلہ واپس اپنے ماحول میں آ جاتی ہے)

رحیلہ : ٹیکسی آ گئی ؟

نادرہ : ہاں ــــ خدا حافظ !

رحیلہ : خدا حافظ !

میاں صاحب : خدا حافظ بیٹی ! ہمیشہ خوش رہو ! ــــ جہاں رہو خوش رہو ۔

(رحیلہ دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

میاں صاحب : بہت اچھی لڑکی ہے ۔

نادرہ : چچا جان ۔

(نادرہ کی آنکھیں پرنم ہو گئی ہیں)

میاں صاحب : نادرہ! تمہیں اس کے جانے کا بہت افسوس ہے؟

نادرہ : چچا جان ! یہی وہ لڑکی ہے جس کا بھائی جان نے اپنی آخری رات کو ذکر کیا تھا ۔ بیچاری کو اس کی موت کا کوئی علم نہیں ہے ۔

میاں صاحب : کیا کہہ رہی ہو تم نادرہ ۔

نادرہ : وہ ان کا انتظار کر رہی ہے ـــــ آج بھی ان کا انتظار کرنے گئی ہے ۔

میاں صاحب : تم نے بتایا اسے ؟

نادرہ : نہیں ۔

میاں صاحب : کیوں ؟

(میاں صاحب دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں ۔ نادرہ جلدی سے ان کے آگے آ جاتی ہے)

نادرہ : نہیں چچا جان ـــــ اسے مت بلائیے ـــــ اسے مت کچھ کہئیے ! وہ اس شخص کا انتظار کرنے گئی ہے جو کبھی نہیں آئے گا ـــــ مگر اسے انتظار کرنے دیجئے ، یہی اس کا سہارا ہے ـــــ اس کا سہارا مت چھینئے ، اس کی زندگی کے اندھیروں میں یہی ایک چراغ ہے ـــــ اسے جلنے دیجئے ـــــ جلتا رہنے دیجئے ۔ چچا جان !

(نادرہ دائیں ہاتھ سے آنسو پونچھتی ہے ـــــ میاں صاحب خاموش کھڑے ہیں ـــــ اور پردہ گرتا ہے ـــــ)

ہمہ آفتاب است

کردار :-

میاں صاحب
بیگم
خان صاحب
رضیہ
اکرم
ثریا
امجد
جاوید
مائی

منظر :—

ایک عام کمرے سے ذرا بڑا کمرہ ۔ جسے گھر والے گول کمرہ کہتے ہیں ۔

ہو سکتا ہے کسی زمانے میں خاص طور پر مہمانوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہو، مگر اب تو کثرت استعمال سے اس کی یہ حالت ہے کہ اس میں اور ایک عام کمرے میں کوئی فرق نہیں ہے ۔

ویسے تو یہاں صوفہ سیٹ بھی ہے ، تپائی پر ریڈیو بھی ؛ کرسیاں بھی اور فرش پر لمبی چوڑی دری بھی لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرنیچر برس ہا برس پہلے جس ترتیب سے رکھا گیا تھا اس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ۔

سامنے کی دیوار سے ذرا ہٹ کر صوفہ سیٹ ۔ شمال مشرق کونے میں ، ایک تپائی کے اوپر ریڈیو سٹ——سٹ کے اوپر کچھ کتابیں اور کپڑے ۔ درمیانی حصے میں چار کرسیاں ، ایک چھوٹی میز ۔ سامنے کارنس پر کچھ کھلونے ، ٹائم پیس ۔ بیچ میں ایک سینری ۔ روئی کا بنا ہوا ایک خرگوش ، چینی کا ایک پیالہ ، سنگ مرمر کی ایک صندوقچی اور اس قسم کی دوسری متفرق چیزیں

ایک دروازہ دائیں دیوار میں جو صحن میں کھلتا ہے اور

دوسرا بائیں دیوار میں جس کے ساتھ میاں صاحب کا کمرہ ہے۔ دونوں دروازوں پر پیازی رنگ کے پردے پڑے ہیں۔

دھوپ روشن دانوں سے اندر آ کر خوب چمک رہی ہے۔

پردہ جس وقت اٹھتا ہے۔ بیگم کمرے میں اس طرح پھر رہی ہیں جیسے بڑی پریشان ہیں۔

عمر پینتیس کے لگ بھگ۔ قد درمیانہ۔ جسم بھرا بھرا۔ رنگ گندمی۔ لباس شلوار، قمیص اور دوپٹہ۔

بیگم کوئی چیز ڈھونڈھ رہی ہیں، کبھی صوفے پر نظر ڈالتی ہیں، کبھی ایک کرسی کو کھسکا کر اس کے نیچے دری کو جھک کر دیکھتی ہیں، پھر وہاں سے کارنس کی طرف جانے لگتی ہیں۔ سنگ مرمر کی صندوقچی اٹھاتی ہیں۔ اسے کھولنے ہی لگتی ہیں کہ میاں صاحب کے کمرے سے مغربی سازینے کی آواز آنے لگتی ہے۔ صندوقچی ہاتھ میں لیے یوں چہرہ بنا لیتی ہیں جیسے اس آواز نے انہیں سخت بیزار کر دیا ہے۔

صندوقچی کا ڈھکنا آٹھاتی ہیں بہت سارے کاغذ نکالتی ہیں۔ ان کا جائزہ لیتی ہیں۔

مطلوبہ چیز انہیں نہیں مل سکی۔ صندوقچہ اسی طرح ہاتھ میں لیے کرسیوں کی طرف آتی ہیں۔ جلدی جلدی کاغذ ڈبے میں ڈالتی ہیں۔ ڈھکنا آٹھاتی ہیں کہ سازینے کی آواز جو ذرا مدھم ہو گئی تھی۔ یک لخت بلند ہو جاتی ہے۔

بیگم ڈھکنا ہاتھ میں لیے میاں صاحب کے کمرے کی طرف جانے لگتی ہیں۔

تین چار لمحوں کے بعد سازینے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔

بیگم واپس آتی ہیں۔ اب ان کے ہاتھ میں ڈھکنے کے علاوہ وہ گراموفون ریکارڈ بھی ہے جو ابھی بج رہا تھا۔ ڈھکنا میز پر رکھ کر صندوقچی میں سے وہ سارے کاغذ نکالتی ہیں۔ ریکارڈ ان کے بائیں ہاتھ ہی میں ہے۔

دائیں دروازے سے کھانسی کی مسلسل آواز آتی ہے۔۔۔اور اس کے ساتھ ہی میاں صاحب دروازے میں سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

بیمار آدمی۔ دراز قد، سر پر جناح کیپ۔ آنکھوں پر عینک۔ چادر اوڑھے ہوئے۔ کھانسی سے جسم لرز رہا ہے۔ غصے کی حالت میں ہیں اس لیے بات جلدی جلدی کہیں گے۔

میاں صاحب : ریکارڈ کیوں لے آئیں تم ؟

بیگم : (بدستور کاغذوں کا جائزہ لیتے ہوئے) اور کیا کرتی؟

میاں صاحب : کیوں ؟

بیگم : (ہاتھ روک کر شوہر کو دیکھتے ہوئے) غضب خدا کا، رات دن، فجر دوپہر، صبح شام ریکارڈ، کان پک گئے ہیں سنتے سنتے !

میاں صاحب : نہ سنو ! کون کہتا ہے سنو !

(بیگم مایوس ہو کر کاغذ صندوقچی میں ڈالنے لگتی ہیں)

بیگم : ایک تو اس گھر میں یہ مصیبت کہ کوئی چیز وقت پر ملتی ہی نہیں اور اوپر سے ہر وقت ٹیں ٹیں، ٹاں ٹاں۔

میاں صاحب : ٹیں ٹیں، ٹاں ٹاں ! میں نے کوئی طوطا تو نہیں پال رکھا، انگریزی ریکارڈ بجاتا ہوں۔

بیگم : تو اب طوطا بھی لے آؤ۔ کون روکتا ہے تمہیں۔۔۔ قسم ہے جو لانڈری کی رسید مل جائے۔ گھنٹہ بھر سے تلاش کر رہی ہوں۔۔۔ کچھ خبر ہے تمہیں ؟

میاں صاحب : مجھے تو اپنی بھی خبر نہیں۔

بیگم : ریکارڈوں کی خبر تو ہے نا

میاں صاحب : ہے اور ضرور ہے !

بیگم : خدا کے لیے اب نہ بجاؤ !

میاں صاحب : تو پھر کیا کروں ؟

بیگم : وہی جو دوسرے لوگ کرتے ہیں ۔

میاں صاحب : دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں ؟

بیگم : اور کچھ کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں ، کم از کم اس طرح بے تحاشا ریکارڈ نہیں بجاتے ۔ صبح سویرے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتا ۔ پتہ نہیں تمہاری طبعیت کیوں نہیں گھبراتی اس سے !

میاں صاحب : کئی دن سے بستر پر پڑا ہوں ، لیٹے لیٹے کس طرح دل بہلاؤں ، کیا کروں ؟

بیگم : آرام کرو ۔ ڈاکٹر نے کہا نہیں ، آپ کے لیے آرام کی سخت ضرورت ہے ۔

(بیگم اس دوران میں لانڈری کی رسید ادھر ادھر تلاش کرتی رہتی ہیں ۔ بار بار کارنس کی طرف جاتی ہیں ۔ چیزیں الٹ پلٹ کرتی ہیں اور ساتھ ہی میاں صاحب سے بھی باتیں کرتی جاتی ہیں)

میاں صاحب : کاش تمہیں معلوم ہوتا موسیقی روح کی غذا ہے ۔

بیگم : مگر روح کو اتنی غذا بھی تو نہ دو کہ اسے بد ھضمی ہو جائے۔

میاں صاحب : بیگم ! تم اتنی بد ذوق ہو، یہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

(بیگم جو کارنس سے مایوس ہو کر لوٹ رہی ہیں اس فقرے پر تلملا جاتی ہیں - گھور کر شوہر کو دیکھتی ہیں)

بیگم : اچھا تو میں بد ذوق ہوں اور تم بڑے اعلیٰ ذوق کے مالک ہو ! سبحان اللہ !!

میاں صاحب : (نرمی سے) میرا یہ مطلب نہیں۔

بیگم : تو کیا مطلب ہے ؟

میاں صاحب : مطلب صرف یہ کہ تم میں ذرا احساس لطیف کی کمی ہے، اور تو کوئی بات نہیں !

بیگم : اس میں بد ذوق کی کیا بات ہے ؟ خیر میں بد ذوق سہی مگر ہمسایوں کو کیا کہو گے ؟ ابھی ابھی بی اماں کہہ رہی تھیں ۔۔۔ یہ تمہارے میاں کو کیا ہو گیا ہے - ہمارے گھر کے لوگوں کو ریکارڈوں کے شور میں چیخ چیخ کر بات کرنی پڑتی ہے - کل میرزا صاحب بھی شکایت کر رہے تھے- اور خان صاحب کی بیوی تو کئی بار کہہ چکی ہیں کہ کیا آپ لوگوں نے ریکارڈوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے اور یہ جو انور صاحب ہیں نا۔۔۔

میاں صاحب : بیگم یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ سارا محلہ میرے خلاف شکایت کر رہا ہے ـــــ سارے کا سارا محلہ میرے خلاف ہو گیا ہے !!

بیگم : میں جھوٹ بولتی ہوں کیا ؟

میاں صاحب : پورا محلہ نہیں ، پورا شہر ، پورا ملک بلکہ پوری کائنات مجھ سے شاکی ہے ـــــ فرش سے لے کر عرش تک ہر ایک کو مجھ سے شکایت ہے ۔

(اب بیگم نرم لہجہ اختیار کر لیتی ہیں)

بیگم : بیمار کو دل ضرور بہلانا چاہیے مگر ـــــ

میاں صاحب : مگر ـــــ

بیگم : یعنی میرا مطلب ہے ـــــ کہ ـــــ اب میں کیا کہوں!

میاں صاحب : جو دل میں آئے کہو ۔ کون روکتا ہے تمہیں؟ ـــــ اونہہ ۔ کیا قیامت ہے ۔ اب بیمار آدمی اپنا دل بھی نہیں بہلا سکتا ! ریکارڈ بھی نہیں بجا سکتا ! نازک کانوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے ۔

بیگم : شوق سے لگاؤ ۔ کون منع کرتا ہے !

میاں صاحب : کیوں نہ لگاؤں؟

(میاں صاحب بیگم کے ہاتھ سے ریکارڈ لے کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں ۔ بیگم صندوقچی اٹھا کر کارنس کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہیں ۔

دوسرے دروازے سے رضیہ آتی ہے ۔

رضیہ نو دس برس کی بچی ہے ۔ سفید فراک میں ملبوس ۔

بال بکھرے ہوئے۔ بیگم رضیہ کو دیکھتی ہیں مگر لانڈری کی رسید تلاش کرنے میں اس طرح مصروف ہیں کہ فوراً اس سے نگاہیں ہٹا لیتی ہیں

رضیہ آگے بڑھتی ہے۔

میاں صاحب کے کمرے سے پھر ریکارڈ کی آواز آنے لگتی ہے رضیہ ماں سے کچھ کہتی ہے مگر ماں سن نہیں سکتی۔)

بیگم : (بلند آواز میں) اونچی آواز میں بکو ! کیا بکتی ہو

رضیہ : امی !

بیگم : کیا ہے ؟

رضیہ : امی—

بیگم : کیا ہے ؟

رضیہ : امی—

بیگم : اب کچھ کہوگی بھی کہ نہیں۔ دیکھی ہے لانڈری کی رسید ؟

رضیہ : امی—

بیگم : دفع ہو مردار—امی امی امی !

(خان صاحب آتے ہیں۔ میاں صاحب کے ہم عمر۔ فربہ اندام کوٹ پتلون پہنے ہوئے۔ ہاتھ میں چھڑی۔ بیگم انہیں دیکھتی ہیں تو جلدی سے موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہیں)

اوہ بھائی جان ! آئیے بھائی جان ! ! تشریف رکھیے۔

(بیگم صوفے کی طرف اشارہ کرتی ہیں)

خان صاحب : ادھر سے گذر رہا تھا۔ میں نے کہا خیریت دریافت کرتا جاؤں۔

بیگم : تشریف رکھئے ۔

(خان صاحب صوفے کی بجائے کرسی میں بیٹھ جاتے ہیں)

اور تو سب خیریت ہے مگر رضیہ کے ابو ــــ

خان صاحب : کیا ہوا بھائی صاحب کو !

بیگم : علیل ہیں ۔

خان صاحب : کب سے ! ــــ یہ ریکارڈ کہاں بج رہا ہے؟

بیگم : وہی بجا رہے ہیں ۔

خان صاحب : کیوں ؟

بیگم : بیمار ہیں ذرا دل بہلا رہے ہیں ۔ اور سارا دن اسی طرح بہلاتے رہتے ہیں بے چارے !

(خان صاحب بہن کے اس طنزیہ انداز پر آسے غور سے دیکھتے ہیں)

خان صاحب : کب سے بیمار ہیں ؟ تکلیف کیا ہے ؟

بیگم : کئی دن سے ہلکی ہلکی کھانسی آ رہی تھی ۔ پھر بخار ہو گیا ۔ کھانسی کم ہو گئی ، بخار اتر گیا اور ــــ

خان صاحب : اور اب ؟

بیگم : بیمار ہیں !

(رضیہ جو ابھی تک وہیں کھڑی ہے ۔ باپ کے کمرے کی طرف چلی جاتی ہے)

خان صاحب : بیمار ہیں ؟

بیگم : جی بھائی جان !

خان صاحب : (اٹھتے ہوئے) اوہو !

(ریکارڈ کی آواز بند ہو جاتی ہے ۔ میاں صاحب کھانستے ہوئے آتے ہیں ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کھانسنے میں تکلف سے کام لے رہے ہیں)

میاں صاحب : خاں صاحب ! معاف کیجئے ۔ مجھے ابھی ابھی آپ کے آنے کی اطلاع ملی ہے ۔

خاں صاحب : طبیعت کیسی ہے بھائی صاحب ؟

میاں صاحب : جی رہا ہوں ۔

خاں صاحب : کس کا علاج ہو رہا ہے ؟

بیگم : یہ پوچھیے بھائی جان ! کہ کس کا علاج نہیں ہو رہا ۔ چند روز ایلوپیتھی سے دلچسپی رہی ، پھر ایک پرانے حکیم صاحب کو تکلیف دی گئی ، دو روز پہلے ہومیوپیتھی سے رابطہ قائم ہوا تھا ــــ یہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا ــــ اب صرف ریکارڈ بجا بجا کر اپنا علاج کر رہے ہیں !

خاں صاحب : ٹھیک ہی تو کرتے ہیں بھائی صاحب ! موسیقی بعض بیماریوں میں بڑی اچھی دوا ثابت ہوتی ہے ۔

بیگم : اس دوا سے انہیں تو آرام آ جائے گا مگر گھر کے لوگ بیمار ہو جائیں گے ۔

خاں صاحب : خدانخواستہ یہ کیوں ؟

بیگم : خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک ایک ریکارڈ سو سو

مرتبہ بجتا ہے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ۔

میاں صاحب : خاں صاحب !

خاں صاحب : ارشاد بھائی جان !

میاں صاحب : آپ جانتے ہیں بیمار کا دل کتنا نازک ہوتا ہے ۔ اب اگر یہ نازک دل بہلایا نہ جائے تو کیا ہو گا ؟

خاں صاحب : صاحب ! بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جائے گی ۔

میاں صاحب : یہ بات ہماری بیگم نہیں سمجھ سکتیں !

بیگم : بہت موٹی عقل ہے بے چاری کی ۔

خاں صاحب : کوئی مضائقہ نہیں بھائی صاحب ! بیمار کا دل ہر حالت میں بہلنا چاہیے !

میاں صاحب : جی ہاں ۔

خاں صاحب : آپ لیٹ جائیے ۔

میاں صاحب : (سینے پر ہاتھ رکھ کر) جی ہاں ۔

خاں صاحب : درد کی شکایت ہے ؟

میاں صاحب : صاحب ! کیا شکایت نہیں ہے ؟

(میاں صاحب کھانستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگتے ہیں ۔ رضیہ آتی ہے اور آ کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

بیگم : رضیہ !

رضیہ : جی امی !

بیگم : باجی سے کہو نیچے آ کر چائے بنائے ۔ کر کیا رہی ہے ؟

رضیہ : امی ! صندوق سے سارے کپڑے نکال رکھے ہیں ۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈھ رہی ہیں ؟

بیگم : جاؤ اس سے کہو ۔ ماموں جان آئے ہیں ۔ آ کر چائے بنا دے ۔

خان صاحب : میرے لیے تکلیف نہ کرو ۔

بیگم : اس میں تکلیف کیا ہے بھائی جان ؟

(ریکارڈ کی آواز آتی ہے)

یہ لیجیے پھر قصہ شروع ہو گیا ۔

خان صاحب : سارا دن اسی طرح شور برپا رہتا ہے ۔

بیگم : اور کیا ۔ کبھی کبھی تو آدھی رات کو بھی ! کل کی بات ہے ، آدھی رات کو ان کے سر پر موسیقی کی دھن جو سوار ہوئی تو ریکارڈ پر ریکارڈ بجانے لگے ۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی ۔ میاں صاحب یہ کیا ہو رہا ہے ؟ کسی کو آرام بھی کرنے دوگے یا نہیں ؟ مرزا صاحب کی بیگم صاحبہ بولیں ۔ میں نے کہا اپنا نہیں تو ہمسایوں ہی کا خیال کیجیے ۔ اس بے وقت کی موسیقی کا کیا مطلب ہے؟ ـــــ ان سے کہا تو کہنے لگے ۔ بیمار ہوں کیا کروں ۔

خان صاحب : ذرا دل بہلا رہا ہوں !

بیگم : (ہنس کر) جی ہاں !

خاں صاحب : یہ تو تکلیف دہ بات ہے ۔

بیگم : اور کیا !

(بیگم دائیں دروازے کے پاس جا کر رضیہ کہہ کر پکارتی ہیں)

خاں صاحب : کیوں بلاتی ہو ؟

بیگم : ثریا کو نیچے بلا کر لانے نا ۔

(بیگم بائیں دروازے میں سے نکل جاتی ہیں چند لمحوں کے بعد لوٹتی ہیں تو ریکارڈ کی آواز بند ہو چکی ہوتی ہے)

خاں صاحب : بھائی صاحب نے ریکارڈ ہٹا دیا ہے ۔

بیگم : جی نہیں دروازے بند کر کے آئی ہوں ۔ انہیں بھلا دل بہلانے سے کون روک سکتا ہے ؟

خاں صاحب : جاوید کہاں ہے ؟

بیگم : فلاسفر صاحب بھی اوپر کمرے میں بند ہیں ۔

خاں صاحب : فلاسفر صاحب کون ؟

بیگم : یہی جاوید میاں !

خاں صاحب : فلاسفر ہو گئے ہیں ؟

بیگم : جانے بلا کیا کچھ ہو گئے ہیں ۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے ۔

خاں صاحب : اکرم سے ملے ہوئے مدت گزر گئی ہے ۔ کبھی نظر ہی نہیں آیا ۔

بیگم : اور نظر آ بھی نہیں سکتا ۔

خان صاحب : نظر آ بھی نہیں سکتا ۔۔۔ کیوں ۔ کیا ہوا خیر تو ہے ؟

بیگم : وہ اپنے فلاسفر بھائی سے ذرا مختلف ہے ۔

خان صاحب : یہ تو ٹھیک ہے ۔ مگر اختلاف کی وجہ کیا ہے ؟

بیگم : دیکھیے نا بھائی جان ! جاوید گھر کے کونے میں بیٹھ کر رات دن نہ جانے کیا گتھیاں سلجھاتا رہتا ہے ۔ کسی سے بات کرنے کی اسے فرصت ہی نہیں ملتی اور یہ اکرم ہے کہ گھر میں ٹکتا ہی نہیں ۔ ابھی ہے اور ابھی غائب !

خان صاحب : کہیں چھلاوہ تو نہیں ہے ؟

بیگم : شائد (مسکراتی ہے) میں کچھ کہہ نہیں سکتی ۔ عادتیں تو چھلاوے کی سی ہیں ۔ اب اللہ جانے کیا ہے ۔۔۔ کیا نہیں ہے !

خان صاحب : آپ پوچھتی نہیں اس سے ۔

بیگم : پوچھوں کیا ۔ شام کے وقت کہیں باہر سے آتا ہے ۔ اور کپڑے بدل کر پھر غائب ۔

خان صاحب : کب تک غائب رہتا ہے ؟

بیگم : کم از کم رات کے دس بجے تک ۔ جب آئے گا تو جلدی جلدی کھانا کھائے گا اور یوں کتاب اٹھا کر بستر پر جائے گا جیسے ایک ایک منٹ بڑا قیمتی

ہے اور اگر ایک منٹ بھی ضائع ہوگیا تو امتحان میں ایک نمبر کم ہو جائے گا ۔

(رضیہ آتی ہے)

خاں صاحب : تو مطالعہ کب تک رہتا ہے ؟

بیگم : کب تک (مسکرا کر) بھائی جان ! کتاب تو محض ایک دکھاوا ہوتا ہے ۔ بستر پر جاتے ہی سو جاتا ہے ۔ میں نے کہا نا ۔ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے ۔

خاں صاحب : (رضیہ سے مخاطب ہو کر) کیوں بیٹی ؟

بیگم : (جلدی سے) باجی سے کہا تو نے ۔

رضیہ : امی ؟

بیگم : جلدی بات کر !

رضیہ : امی ؟

بیگم : تو نے یہ امی امی کی رٹ لگا دی ۔ کیا ہے ـــ کیا کہنا چاہتی ہے ۔

رضیہ : بڑے بھائی جان آئے ہیں ۔

خاں صاحب : بڑے بھائی جان کون ؟

بیگم : بڑے بھائی جان ـــ اکرم ـــ پتا نہیں آج کیا معاملہ ہے جو دن کے وقت یہاں آگیا ہے ۔

(اکرم آتا ہے ۔ قمیص اور پتلون پہنے ہوئے لمبا تڑنگا ۔ چہرے پر پریشانی ۔ بات جلدی جلدی کرتا ہے ـــ رضیہ جاتی ہے)

اکرم : (خاں صاحب کو نہیں دیکھتا) امی ! میری اچکن دیکھی آپ نے ؟

بیگم : اور تو نے ماموں جان کو نہیں دیکھا ؟

اکرم : ماموں جان کو ــــ

(خان صاحب پر اس کی نظر پڑتی ہے)

اوہو ــــ ماموں جان معاف کیجیے ! آپ کو دیکھ ہی نہ سکا !

خان صاحب : میاں دیکھ تو رہے ہو مجھے اور کس طرح دیکھو گے !

اکرم : جی ہاں ۔ کیسے ہیں آپ ۔ مزاج اچھے ہیں نا ــــ بڑی مدت کے بعد آئے ہیں ۔ اعجاز کا کیا حال ہے ! ممانی کی طبیعت کیسی ہے ــــ آپ مکان بدل رہے تھے ــــ

(خان صاحب ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہو جانے کے لیے کہتے ہیں)

خان صاحب : بس بھئی بس ! مجھے تو یاد بھی نہیں رہا کہ تم نے کیا کیا بات پوچھی ہے ۔ ایک دم اتنے سارے سوال جڑ دیے ہیں ۔

بیگم : اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ یہاں آوے ــــ

اکرم : امی ! ــــ اوہ معاف کیجیے ماموں جان ! مجھے در اصل بڑی جلدی ہے !

خان صاحب : تو کہو کیا کہنا چاہتے ہو ؟

اکرم : معاملہ یہ ہے ماموں جان ! میرا ایک دوست بڑی دور سے آ رہا ہے ۔

خاں صاحب : بڑی دور سے آ رھا ھے تو تم اس طرح پریشان کیوں ھو گئے ھو ؟

اکرم : پریشان تو بالکل نہیں ھوں ۔

خاں صاحب : تو پھر تردد کیا ھے ؟

اکرم : پریشانی یہ ھے ماموں جان ——

(بیگم اور خاں صاحب دونوں ھنس پڑتے ھیں)

خاں صاحب : پریشان بالکل نہیں ھوں —— اور پریشانی یہ ھے ماموں جان —— ماشاءاللہ زندہ دل معلوم ھوتے ھو ۔

بیگم : اب تو آپ نے مان لیا ھو گا میں درست ھی کہتی ھوں نا !

خاں صاحب : آپ درست ھی کہتی ھیں مگر اب کہتے کیا ھیں یہ —— کیوں اکرم ؟

اکرم : (اماں سے) امی ! اچکن کمرے میں نہیں ھے ۔

خاں صاحب : مگر برخوردار ! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمہارے اس بڑی دور سے آنے والے دوست کو اچکن سے کیا تعلق ؟

اکرم : کچھ دوستوں نے طے کیا ھے کہ سب مل کر اسے Receive کریں گے ۔

خاں صاحب : سب مل کر Receive کریں گے اور ھر ایک اچکن پہن کر آئے گا ۔

اکرم : جی نہیں ۔ اچکن صرف میں پہنوں گا ۔

خاں صاحب : سوٹ کیوں نہیں پہنو گے ۔

اکرم : دونوں سوٹ میلے ھیں ۔

خاں صاحب : پھر تو مجبوری ھے ۔

اکرم : جی ھاں ۔ (ماں سے) بتائیے نا امی ! اچکن کہاں ھے میری ؟

بیگم : کون سی اچکن ؟

اکرم : ایک ھی تو اچکن ھے میرے پاس ۔

بیگم : لیجیے بھائی جان ! یہ بھی فلاسفر بن گیا ھے ۔

خاں صاحب : مبارک ھو آپ کو ۔ مگر فلاسفر بن کیسے گیا ھے ۔

بیگم : دنیا اور مافیہا سے بے نیاز ھو گیا ھے (اکرم سے) یاد نہیں رھا تجھے ، ابھی پرسوں تو اپنی اچکن تو نے لانڈری کو ڈبل ریٹ پر بھجوائی ھے ۔

اکرم : ھاں یاد آیا ۔

بیگم : دیکھا آپ نے بھائی جان ۔

خاں صاحب : دیکھ رھا ھوں ـــ خوب دیکھ رھا ھوں ۔

اکرم : تو لانڈری سے منگوا لی ؟

بیگم : مائی سے پوچھو ـــ مجھ سے کیا پوچھ رھے ھو ؟

اکرم : مائی کہاں ھے ؟

بیگم : ھو گی گلی میں ـــ کسی سے باتیں ھو رھی ھوں گی ۔

سوائے باتیں کرنے کے اسے اور کیا کام ھے ۔

اکرم : (بلند آواز سے) مائی ! مائی ! !

بیگم : یوں نہیں آئے گی ۔ نہ جانے ھے کہاں ؟ رضیہ کو بھیجو اس کی تلاش میں !

(بیگم دروازے کے پاس جا کر پکارتی ھیں ۔ ”رضیہ ! رضیہ ! !)

رضیہ : (باھر سے) امی !

بیگم : مائی کہاں ھے !

رضیہ : جی امی !

بیگم : میں پوچھتی ھوں مائی کہاں ھے ؟

رضیہ : آتی ھوں امی !

بیگم : (غصے سے) مائی کو بھیج ۔

رضیہ : مائی کو !۔۔۔اچھا امی !

اکرم : امی ! آپ کو خبر نہیں کہ اچکن وھاں سے لائی گئی ھے یا نہیں !

بیگم : مجھے اور کام تھوڑے ھیں جو تمھاری اچکن کا بھی خیال رکھوں ۔ تمھیں اس کا خیال رکھنا چاھیے تھا ۔

(مائی آتی ھے۔۔۔بوڑھی عورت ۔ کمر خمیدہ ۔ آنکھوں پر عینک ۔ شلوار ، قمیص اور دوپٹے میں ملبوس)

مائی : آپ نے بلوایا ھے بی بی جی !

اکرم : مائی ! میری اچکن لے آئی تھیں ۔

مائی : اچکن ؟

اکرم : ھاں مائی اچکن ھی کی بات تو کر رھا ھوں ۔

مائی : کہاں سے لانی تھی ۔

اکرم : دیکھا تماشا امی ! کہتی ہے کہاں سے لانی تھی ۔

خاں صاحب : بھول گئی ہے ۔ یاد کراؤ اسے ۔

بیگم : مائی ! پرسوں اکرم کی اچکن لانڈری کو دینے گئی تھی یا نہیں ؟

مائی : وہ اچکن لانڈری میں دینی تھی ؟

بیگم : تو اور کہاں دینی تھی ؟

مائی : لانڈری میں تو میں نے آپ کی قمیص دی تھی ۔

اکرم : میری اچکن امی کی قمیص کس طرح بن گئی ؟

مائی : انہوں نے قمیص لانڈری میں دینے کو کہا تھا ؟

بیگم : ستیاناس ہو تیرا مائی ۔ میری قمیص لانڈری میں دے آئی تھی اور اچکن ــــ

مائی : وہ جمیلہ کے گھر پہنچا دی تھی ۔

اکرم : یہ معما کیا ہے ؟

بیگم : معما کیا ہوگا خاک ــــ لانڈری کو جا رہی تھی ۔ راستے میں جمیلہ کا گھر ہے ۔ میں نے اپنی قمیص اس کے حوالے کر دی کہ جمیلہ کے گھر دیتی جانا اور اچکن لانڈری کو دے آئے !

خاں صاحب : اور اس نے قمیص تو لانڈری کو دے دی اور اچکن جمیلہ کے گھر پہنچا دی ! کیا بات ہے ۔

بیگم : مائی !

مائی : جی بی بی ۔

بیگم : میں پوچھتی ھوں تجھے کیا ھو گیا ھے ۔ تو تو چنگی بھلی تھی ۔

مائی : ھاں بی بی پہلے تو چنگی بھلی تھی ۔

بیگم : بھائی جان بتائیے اس گھر میں رہ کر آدمی پاگل نہیں ھو گا تو اور کیا ھو گا ـــ یہاں تو آوے کا آوا ـــ

خان صاحب : (جلدی سے) اکرم بیٹا !

اکرم : جی فرمائیے !

خان صاحب : میاں ! یا تو اچکن منگوا لو یا کوئی اور انتظام کرو ۔

اکرم : اچکن میلی کی میلی ھو گی ۔

خان صاحب : میلی تو ضرور ھو گی ـــ کوئی کوٹ ووٹ نہیں ھے تمہارے پاس !

اکرم : کوٹ تو الماری میں ھے ـــ مگر پتلون سے میچ نہیں کرتا ۔

بیگم : وہ تمہارے پرانے ٹرنک میں بھی ایک پتلون پڑی تھی ۔

اکرم : ھاں وہ ٹھیک رھے گی کوٹ کے ساتھ ۔

خان صاحب : تمہارا مسئلہ حل ھو گیا اب ؟

اکرم : خیال تو یہی ھے ۔

(اکرم دروازے میں سے نکل جاتا ھے)

بیگم : مائی ! اب مہربانی کر کے کپڑے تو لے آ دونوں جگہوں سے ۔

مائی : اچھا بی بی جی !

(مائی چلی جاتی ہے ــــ دوسرے کمرے سے ''ٹھک ٹھک'' کی آواز آنے لگتی ہے)

خاں صاحب : یہ شور کیسا ہے ؟

بیگم : کیا خبر ! (آواز دے کر) اکرم !

اکرم : جی !

بیگم : کیا ہو رہا ہے ۔

اکرم : کچھ نہیں ۔

بیگم : پتا نہیں کیا کر رہا ہے ؟

(بیگم دروازے میں سے نکل جاتی ہے ۔ ''ٹھک ٹھک'' کی آواز بند ہو جاتی ہے ــــ خاں صاحب دروازے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں ۔ بیگم واپس آتی ہے)

خاں صاحب : کیا ہوا ؟

بیگم : جناب نے اپنے ٹرنک کا ستیاناس کر دیا ہے ۔ ہتھوڑا مار مار کر ۔

خاں صاحب : وہ کیوں ؟

بیگم : اس کی چابی اچکن کی جیب میں رہ گئی تھی ۔

خاں صاحب : اچکن تو لائی جا رہی ہے ۔

(اکرم آتا ہے ۔ نئے سوٹ میں ملبوس)

اکرم : میں انتظار نہیں کر سکتا ۔ گاڑی آنے میں صرف چند باقی رہ گئے ہیں ۔

(اکرم دروازے کی طرف رخ کرتا ہے)

خان صاحب : بیٹا Receive کسے کرنے جا رہے ہو ؟

اکرم : ایک دوست جرمنی سے آ رہا ہے ۔ آج لاہور اسٹیشن پہنچے گا ۔

خان صاحب : محمود کے بیٹے شہزاد کو Receive کرنے جا رہے ہو کیا ؟

اکرم : جی ہاں !

خان صاحب ، سبحان اللہ !

(اکرم حیران ہو کر خان صاحب کو دیکھتا ہے)

اکرم : ماموں جان ! وقت بہت کم ہے ۔

خان صاحب : میاں Receive کسے کرو گے ۔ شہزاد تو پیر کے روز یہاں پہنچ رہا ہے ۔ آج جمعرات ہے ۔

اکرم : ماموں جان !

خان صاحب : بھائی ! میں ٹھیک کہتا ہوں ۔ اعجاز بھی اسے Receive کرنے جائے گا ۔

بیگم : دیکھا بھائی جان ! آوے کا آوا ہی ——

اکرم : ماموں جان ! ایک ضروری کام یاد آ گیا —— معاف کیجیے —— اوہ !

(اکرم بڑی تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکل جاتا ہے)
(ریکارڈ کی آواز آتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی میاں صاحب آتے ہیں)

میاں صاحب : (بیگم سے) وقت کیا ہوا ہے ؟

خان صاحب : (کلائی پر نظر ڈال کر) ڈیڑھ بج گیا ہے ۔

میاں صاحب : مجھے کھچڑی کتنے بجے مل جانی چاہیے —— تم سے پوچھ رہا ہوں بیگم !

بیگم : کھچڑی مل جائے گی ۔

میاں صاحب : کب ! جس وقت میری انتڑیاں قل ہو اللہ کا ورد کرتے کرتے بے دم ہو جائیں گی (خان صاحب سے مخاطب ہو کر) ڈاکٹر نے تاکید کی ہے کہ آپ ایک بجے تک کھچڑی ضرور کھا لیا کریں اور اب بج رہا ہے پورا ڈیڑھ ۔ صاحب ! پورے تیس منٹ اوپر ہو چکے ہیں اور ابھی کھچڑی کا نام و نشان تک نہیں !

خان صاحب : کھچڑی کا کیا ہے بھائی صاحب ! ابھی تیار ہو جاتی ہے ۔

میاں صاحب : نہیں تیار ہو گی صاحب !

خان صاحب : کیوں ؟

میاں صاحب : اس لیے کہ الماری کی چابی نہیں ملے گی ۔ چابی نہیں ملے گی تو الماری نہیں کھلے گی ۔ الماری نہیں کھلے گی تو پرس نہیں نکلے گا ۔ پرس نہیں نکلے گا تو دال

منگوانے کے لیے پیسے نہیں ملیں گے اور دال نہیں آئے گی تو کھچڑی ـــــ

خاں صاحب : (ھنس کر) نہیں بھائی صاحب ! ایسا نہیں ھو گا ۔

میاں صاحب : تو دیکھ لیجیے !

(میاں صاحب اپنے کمرے میں چلے جاتے ھیں ! ریکارڈ کی آواز بند ھو جاتی ھے)

خاں صاحب : کیا کہتے ھیں بھائی صاحب ؟

بیگم : انہیں تو ایسی باتیں کہنے کی عادت ھے ؟

خاں صاحب : بھائی صادت کے لیے کھچڑی تیار کر دو نا !

بیگم : ابھی ھو جاتی ھے (پکارتے ھوئے) رضیہ ! او رضیہ کی بچی ۔

(باھر سے جی امی کہتی ھوئی رضیہ کی آواز آتی ھے)
ادھر جا ، باجی کے پاس ، الماری کی چابی لے آ ۔

(رضیہ آتی ھے)

رضیہ : جی امی !

بیگم : سنا نہیں تو نے !

خاں صاحب : رضیہ بیٹی ! اپنی باجی سے چابی لے آؤ ۔

بیگم : اور کہو کہ نیچے آئے ۔ ماموں جان آئے ھیں ۔

رضیہ : اچھا ۔

بیگم : عجیب مصیبت ھے اس گھر میں ۔

خان صاحب : بھائی صاحب گھر سے باہر نہیں جاتے ؟

بیگم : کہاں جاتے ہیں ! ریکارڈوں سے فرصت ملے تو باہر بھی جائیں ۔ اور جائیں گے بھی تو پانچ سات نئے ریکارڈ اُٹھا لائیں گے ۔

خان صاحب : (ہنس کر) خوب !

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ : امی !

بیگم : چابی لے آئی ہو ؟

رضیہ : باجی کہتی ہیں مجھے چابی کی کیا خبر ۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں !

بیگم : کہا ہے ماموں جان آئے ہیں ؟

رضیہ : کہتی ہیں ابھی آتی ہوں ۔

(بیگم کارنس کی طرف جاتی ہیں اور چابی ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتی ہیں)

بیگم : آتی کیوں نہیں ؟

رضیہ : پوچھتی ہیں لانڈری سے میرا دوپٹہ منگوایا ؟

بیگم : خاک منگوائی ہے اُس کے لیے — لے لے آ کر ۔

خان صاحب : اوہو ۔ اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے ؟

بیگم : دو گھنٹے ہو گئے ہیں نواب زادی نیچے ہی نہیں اترتی ۔

(میاں صاحب آتے ہیں ۔ رضیہ کھسک جاتی ہے)

میاں صاحب : (خان صاحب سے) دیکھ لیا خان صاحب !

خاں صاحب : کوئی بات نہیں !

میاں صاحب : اور تو کوئی بات نہیں ۔ صرف چابی گم ہوگئی ہے میں نے کہا نہیں تھا ۔ چابی نہیں ملے گی تو الماری نہیں کھلے گی !

خاں صاحب : مل جائے گی ۔

میاں صاحب : نہیں ملے گی ـــــ ہرگز نہیں ملے گی ۔ گزشتہ بیس بائیس برس سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں ۔ دن میں سات مرتبہ چابی گم ہوجاتی ہے ۔

بیگم : آپ کو تو باتیں بنانے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے ۔

میاں صاحب : میں گویا باتیں بنا رہا ہوں ؟

خاں صاحب : بھائی صاحب ! چابی ابھی مل جاتی ہے ۔

میاں صاحب : خاں صاحب ! ہماری بیگم کی روایت یہ ہے کہ ہر روز باربار چابی گم کر دی جاتی ہے اور پھر ایک طوفان برپا ہوجاتا ہے ۔ صرف چابی ہی نہیں ہر شے کھو دیتی ہیں ۔ مجھے ڈر ہے تو یہ ہے کہ کسی دن اپنے آپ کو نہ کھو دیں ۔ پھر کیا ہوگا ؟

بیگم : (میاں صاحب کو غصے سے دیکھ کر) میں نے کہا ـــ

میاں صاحب : ہو سکتا ہے صاحب ! ضرور ہو سکتا ہے کسی دن اپنے آپ کو کہیں رکھ کر بھول جائیں گی ۔ اس دن تو قیامت ٹوٹ پڑے گی ۔

بیگم : مہربانی کر کے اپنے کمرے میں چلے جائیں !

میاں صاحب : جاتا ہوں ۔ ضرور جاتا ہوں ۔

(میاں صاحب اپنے کمرے میں جانے لگتے ہیں ۔ دو تین لمحوں کے بعد ریکارڈ کی آواز رک جاتی ہے)

خاں صاحب : چابی نہیں ملتی تو نہ سہی ۔

(خاں صاحب جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالتے ہیں)

دال وغیرہ منگوا لیجیے ۔

بیگم : نہیں بھائی جان!

خاں صاحب : اس میں آخر حرج ہی کیا ہے ۔ کھچڑی تو تیار کرا دو ۔ بیمار آدمی کمزور ہو جاتا ہے ، بھوک برداشت نہیں کر سکتا ۔

بیگم : رضیہ دوکان دار سے لے آتی ہے بعد میں پیسے دے دیں گے ۔

خاں صاحب : میرے اور تمہارے پیسوں میں کیا فرق ہے ۔ بلاؤ رضیہ کو ۔

بیگم : (غصے سے آواز دے کر) رضیہ کی بچی !

(رضیہ کی کسی قدر دور سے آواز آتی ہے ''جی امی'')

جی امی کی بچی جلدی آ ۔

(رضیہ آتی ہے)

کیا کر رہی ہے تو ؟

رضیہ : میری گڑیا کا بیاہ ہے آج ۔

خاں صاحب : کب ؟

رضیہ : شام کو ۔

بیگم : شام کو بیاہ ہے تو باربار کیوں چلی جاتی ہے ادھر ؟

رضیہ : تیاری تو کرنی ہے نا ۔

بیگم : میں کہتی ہوں بھائی جان ! یہ گھر کیا ہے ، ایک مصیبت خانہ ہے سہیلیاں شام کو آنے والی ہیں اور صاحبزادی صبح سے تیاریوں میں مصروف ہے ۔ یہ تماشا ہوتا رہتا ہے اس گھر میں ۔

خاں صاحب : بیٹا (روپیہ دیتے ہوئے) کھچڑی کے لیے دال لے آ ۔

بیگم : اور اس نواب زادی سے کہو کہ نیچے آ کر کام کرے ۔

(رضیہ روپیہ لے کر نکل جاتی ہے)

کیا کروں بھائی جان ! اس گھر میں کسی کو بھی اپنی ذمے داری کا احساس نہیں ہے ۔

(ثریا آتی ہے ، اٹھارہ انیس برس کی لڑکی ۔ سر کے بال بکھرے ہوئے چہرے پر وحشت سی برس رہی ہے)

ثریا : سلام علیکم ماموں جان!

خاں صاحب : وعلیکم السلام ۔

بیگم : یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے ؟

خاں صاحب : کیا ہے ثریا بیٹی ؟

ثریا : ایک سہیلی کی سال گرہ ہے ۔

خان صاحب : تو ٹھیک ہے ۔ وہاں جانا ہے ؟

ثریا : جاؤں کیسے ۔ امی لانڈری سے دوپٹہ منگوا کر ہی نہیں دیتیں ۔

بیگم : اور کوئی دوپٹہ نہیں ہے گھر میں ؟

ثریا : مگر کوئی سوٹ سے میچ ہی نہیں کرتا !

بیگم : سوٹ پہننا کوئی ضروری ہے ؟

خان صاحب : ہاں بیٹا ایک خاص رنگ کے دوپٹے کے لیے اتنی پریشانی کیوں ؟

بیگم : گھر میں ایک چھوڑ دس دوپٹے موجود ہیں مگر صبح سے ضد کر رہی ہے کہ پیازی رنگ کا ہی دوپٹہ چاہیے !

ثریا : لانڈری سے منگوا کیوں نہیں دیتیں ؟

بیگم : منگواؤں کیا خاک ؟ لانڈری کی رسید ہی نہیں مل رہی !

ثریا : آپ نے رکھی کہاں تھی ؟

بیگم : یہ خبر ہوتی تو وہاں سے نکال نہ لیتی ۔ پوچھتی ہے رسید کہاں رکھی تھی ؟

ثریا : وقت پر کوئی چیز بھی تو نہیں ملتی اس گھر میں !

بیگم : آگ لگاؤ نہ اس گھر کو ــ کس دیدہ دلیری سے باتیں بنا رہی ہے ۔ نہ ماں کی عزت نہ ماموں کا لحاظ !

خاں صاحب : ثریا بیٹا !

ثریا : ماموں جان میں نے کہا کیا ہے ۔ یہی کہا ہے نا کہ آپ ہر چیز کہیں رکھ کر بھول جاتی ہیں ۔

خاں صاحب : کوئی بات نہیں تم کوئی اور دوپٹہ لے لو ۔

ثریا : سہیلی کی سالگرہ پر جاؤں اور کپڑے بھی ڈھنگ کے نہ پہن کر جاؤں ؟

بیگم : ڈھنگ کے کپڑے کیا ہوتے ہیں ؟

ثریا : دوپٹہ سوٹ سے میچ ہی نہ کرے تو ڈھنگ کے کپڑے کیسے ہوئے ؟

بیگم : دوپٹہ کسی اور رنگ کا اوڑھ لو گی تو سہیلیاں طعنے دے دے کر کیا تمہارا دل چھلنی کر دیں گی ؟

خاں ضاحب : دیکھو بیٹا ! دوپٹے ایک چھوڑ سات آٹھ ہوں گے ۔ کوئی دوپٹہ چن لو اور پھر اس کے رنگ کے مطابق شلوار اور قمیض کا انتخاب بھی کر لو ۔

ثریا : ماموں جان پیازی سوٹ ـــــ

بیگم : صاحبزادی پیازی رنگ کا سوٹ ہی پہنے گی اور کسی کو ہاتھ نہیں لگائے گی ۔

ثریا : امی ! میں نے کہہ دیا ہے ، میں نہیں جاتی ۔ بس بات ختم ہو گئی ۔

بیگم : نہ جاؤ میری جوتی پروا کرتی ہے تمہاری ۔

خاں صاحب : اوھو ۔ ثریا ــــ بیٹی ــ

ثریا : نہیں ساسوں جان ، میں نہیں جاتی ــ بالکل نہیں جاتی ــ اور کبھی کہیں نہیں جاؤں گی ــ نہیں جاؤں گی ۔

(لگتا ھے ابھی رو پڑے گی اور شاید اسی چیز کا احساس کر کے بائیں دروازے سے نکل جاتی ھے)

بیگم : جا کہاں رھی ھو ؟ باپ کے لیے کھچڑی پکاؤ (خاں صاحب سے) دیکھا آپ نے تماشا ۔ ضرور پیازی سوٹ ھی پہننا ھے اور کوئی نہیں پہننا ۔ حد ھو گئی ھے یا نہیں ؟

(رضیہ رومال میں دال لے کر آتی ھے)

رضیہ : لو امی!

(رضیہ ماں کے ھاتھ میں رومال دے کر باھر جانے لگتی ھے)

بیگم : ٹھہر ، ذرا ۔

رضیہ : امی آدھر میری گڑیا کے کپڑے بکھرے پڑے ھے ۔

بیگم : بکھرے رہنے دو ۔

(بیگم رومال کھولتی ھیں)

لاحول ولا ــــ

خاں صاحب : کیا ھوا ؟

بیگم : چنے کی دال آٹھا لائی ھے ــــ (رضیہ سے) نو سال کی عمر ھو گئی مگر ابھی دودھ پیتی بچی ھے تو

نامراد کھچڑی چنے کی دال کی بنتی ہے ؟

خان صاحب : چنے کی دال ؟ اوہو !

بیگم : دھیان تو اس کا گڑیوں میں ہے ۔ سودا کیا خرید کر لائے گی پہلے ہی چیخ رہے ہیں کہ مجھے وقت پر کھچڑی نہیں ملتی !

(رضیہ چپ چاپ کھڑی رہتی ہے)

خان صاحب : رضیہ !

رضیہ : جی !

خان صاحب : جس دوکان دار سے لائی ہے اس سے کہہ دے، ماش کی چھلکے والی دال دے دے ! جلدی کر (آہستہ آہستہ لفظ منہ سے نکالتے ہوئے) ماش کی چھلکے والی دال !

(ریکارڈ کی بلند آواز آتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میاں صاحب نے دروازہ کھولا ہے اور اب وہ آ رہے ہیں رضیہ دروازے کی طرف جانے ہی لگتی ہے کہ میاں صاحب آ جاتے ہیں)

خان صاحب : بھائی صاحب !

میاں صاحب : فرمائیے !

خان صاحب : کھچڑی ابھی تیار ہو جاتی ہے ۔

میاں صاحب : اب ضرورت نہیں ۔ ایک آدھ گھونٹ دودھ کا پی لوں گا ! آدمی زندہ تو رہ سکتا ہے اس طرح !

(میاں صاحب جانے لگتے ہیں ۔ رضیہ موقع پا کر دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے)

خان صاحب : کھچڑی پکانے میں دیر لگ جائے گی ۔ دودھ منگوا لو !

بیگم : کھچڑی بعد میں پک جائے گی ۔ یہ رضیہ کہاں گئی؟ دیکھا کس طرح کھسک گئی ہے (زور سے آواز دے کر) رضیہ ۔ او رضیہ کی بچی !

(رضیہ کی باہر سے آواز ۔ ''جی امی'')

جلدی آ ۔

خان صاحب : دودھ سے کیا ہو گا ۔ کھچڑی ضرور پکا دینا !

بیگم : جی بہتر !

(رضیہ آتی ہے)

گڑیوں کا خیال کسی وقت چھوڑے گی بھی یا نہیں ؟ مردار ! جلدی سے دودھ لے کر آ اور چینی ڈال کر اپنے ابی کو دے !

(رضیہ کمرے سے نکل جاتی ہے)

خان صاحب : جاوید نیچے نہیں آتا ؟

بیگم : آتا ہے مگر خاص خاص موقع پر ۔

خان صاحب : خاص خاص موقع پر ! کیا مطلب ؟

بیگم : جب بھوک لگے یا اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی

مہمان آیا ہے ۔

خاں صاحب : شاید میں مہمان نہیں ہوں ۔

بیگم : آپ مہمان تو نہیں مگر آپ کے بارے میں سنے گا تو ضرور نیچے آئے گا ۔

(رضیہ کی آواز آتی ہے)

رضیہ : امی !

بیگم : کیا ہے ؟

رضیہ : چینی کہاں ہے ؟

بیگم : مجھ سے پوچھتی ہے چینی کہاں ہے ، تجھے معلوم نہیں ہے ؟

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ : امی ! وہاں نہیں ہے ۔

بیگم : کیوں ـــ یہ امجد صبح راشن کارڈ لے کر گیا تھا ۔ چینی لایا نہیں تھا کیا ؟

رضیہ : نہیں امی !

بیگم : آج آخری دن تھا ـــ حد ہو گئی ہے ۔ شہزادہ صاحب صبح سے گئے ہیں اور ابھی تک لوٹے نہیں !

خاں صاحب : رضیہ بیٹی ! چینی خرید لاؤ بازار سے ۔

(رضیہ چلی جاتی ہے ۔ کسی قدر دور سے سیٹی کی آواز آتی ہے)

یہ کون ہے ؟

بیگم : امجد ہے اور کون ہو گا ؟

(امجد آتا ہے ۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ۔ گیارہ برس کے لگ بھگ عمر ۔)

امجد : اوہ ماموں جان ! — السلام —

بیگم : دن بھر کہاں رہا ہے ؟ گھر کی کوئی فکر ہے یا نہیں ؟ راشن کارڈ لے کر چینی لینے گیا تھا ، میں پوچھتی ہوں اتنی دیر تک کرتا کیا رہا ہے ؟

امجد : (بڑے اطمینان سے) فٹ بال کھیلتا رہا ہوں !

بیگم : فٹ بال کھیلتا رہا ہے ؟

امجد : جی امی !

بیگم : آٹھ بجے سے اب تک ؟

امجد : میچ جلدی ختم ہو گیا ورنہ شام کو آتا ۔

بیگم : راشن کارڈ کہاں ہے ؟

امجد : (راشن کارڈ نکال کر) یہ رہا ۔

بیگم : اور چینی ؟

امجد : راشن کی دوکان میں ہے !

بیگم : لے کر کیوں نہیں آیا ؟

امجد : میچ کھیلتا کہ چینی خریدتا ؟ امی ! ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے دو نہیں ہو سکتے !

بیگم : دیکھا آپ نے آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے ؟

(جاوید آتا ہے ۔ عمر پچیس برس کے قریب ۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ۔ داڑھی بڑھی ہوئی ۔ آنکھوں پر عینک ۔)

چہرے پر یبوست سی برس رہی ہے)

جاوید : ہیلو ماموں جان !

خاں صاحب : فرمائیے طبیعت تو ٹھیک ہے !

جاوید : وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا ۔

خاں صاحب : اپنی طبیعت کے متعلق وثوق سے کہا نہیں جا سکتا !

جاوید : جی ہاں ۔ انسان دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے ۔ اپنے متعلق نہیں !

بیگم : بھائی جان ! ابھی آتی ہوں ۔ یہ رضیہ تو بس نکمی لڑکی ہے ۔

(بیگم باہر جاتی ہیں اور ان کے فوراً بعد امجد بھی چلا جاتا ہے)

خاں صاحب : تمہارے بارے میں ٹھیک ہی سنا تھا ۔ واقعی فلاسفر بن گئے ہو !

جاوید : نہیں ۔

خاں صاحب : کیا نہیں ؟

جاوید : فلاسفر تو نہیں بن سکا ۔ البتہ کچھ غور و فکر کیا ہے ۔

خاں صاحب : اس غور و فکر سے کس نتیجے پر پہنچے ہو ؟

جاوید : کس نتیجے پر پہنچا ہوں ـــ

(عینک اتار کر اسے دو تین بار گھماتا ہے اور پھر آنکھوں پر لگا لیتا ہے)

خاں صاحب : کوئی نہ کوئی نتیجہ تو نکالا ہے نا ؟

جاوید : ماموں جان !

خاں صاحب : ارشاد برخوردار !

جاوید : مجھے اس لفظ سے نفرت ہے ۔ برخوردار کیا ہوا ؟

خاں صاحب : ارشاد فلاسفر صاحب !

جاوید : چلئے یونہی سہی ۔ میں یہ عرض کر رہا تھا ، نہیں عرض کرنے والا تھا کہ یہ جو انسانی زندگی ہے نا ۔ ایک بحر ناپیدا کنار ہے ۔ ہر موج اپنی دنیا میں سفر کر رہی ہے اور سفر بھی تنہا کر رہی ہے ۔ کوئی بھی اس کا ساتھی نہیں ہے ۔ انسان بھی سفر کر رہا ہے اکیلا اور تنہا ۔ راستہ خاموش اور سنسان ہے اور اندھیرے ہیں کہ ارد گرد چھائے رہتے ہیں ۔ دور ایک کرن نظر آتی ہے ـــ

خاں صاحب : ایک کرن نظر آتی ہے ۔

جاوید : دور ـ بہت دور ۔ انسان اس کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے اور اس تگ و دو میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے ۔ کرن کہیں تو جگنو بن جاتی ہے کہیں ایک ستارا اور کہیں افق کے نیچے پہاڑ کی چوٹی پر چمکتی ہوئی برف کی ایک جھلک ۔ انسان لاکھ کوشش کرے یہ روشنی ہاتھ نہیں آتی ۔ سب تگ و دو بے سود ثابت

ہوتی ہے ۔ روشنی کی یہ کرن ایک فریب ہے ، ایک تخیل ہے ، ایک خواب ہے ! کچھ ہے بھی اور نہیں بھی ۔ نہیں بھی اور ہے بھی ، ہے بھی اور نہیں بھی ۔ ہے اور نہیں کے درمیان ایک بڑا پراسرار خلا ہے ! اب بتائیے اسے کون سمجھ سکتا ہے ۔

خاں صاحب : کوئی نہیں ۔ معلوم ہوتا ہے آجکل فلسفے کی خاص بلندیوں پر اڑ رہے ہو ۔

جاوید : اڑ نہیں رہا سفر کر رہا ہوں !

خاں صاحب : سفر کر رہے ہو ؟

جاوید : سفر، رات دن سفر، صبح و شام سفر، ہر لمحہ سفر، ہر گھڑی سفر !

(بیگم آتی ہیں)

بیگم : بھائی جان ! آپ کس مصیبت میں پھنس گئے ۔ یہ لڑکا آپ کا دماغ خراب کر دے گا !

جاوید : یہ انسانی زندگی کا المیہ ہے ۔ انسان زندگی اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو کہتے ہیں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے ۔

خاں صاحب : حالانکہ اس کا دماغ روشن ہونے لگتا ہے ۔

جاوید : یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ انسان کا مقدر تو یہ ہے کہ وہ روشنی کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے ۔ اس سفر میں بے شمار منزلوں ، مرحلوں اور زمینوں اور

آسمانوں سے گزرتا ہے ، سفر کہیں ختم نہیں ہوتا ۔

(ریکارڈ کی تیز آواز — بیگم اور خاں صاحب دروازے کی طرف دیکھتے ہیں ۔ میاں صاحب آتے ہیں ۔ ہاتھ میں گلاس ہے)

میاں صاحب : (خاں صاحب سے) لیجے ملا خطہ فرمائیے ۔

خاں صاحب : کیا ہوا بھائی صاحب ؟

میاں صاحب : دو بجے دن کے دودھ دیا ہے تو وہ بھی بالکل پھیکا ۔

جاوید : کوئی بات نہیں ! اباجان ! انسانی زندگی بھی بڑی پھیکی ہے ۔

میاں صاحب : چپ کر او فلاسفر کے بچے ——

جاوید : (باپ کو غور سے دیکھ کر) یعنی آپ بھی فلاسفر ہیں ؟ آج تو میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۔

بیگم : سمجھ میں نہیں آتا یہ ہو کیا رہا ہے ؟

جاوید : سفر اور سفر —— صرف سفر ۔

بیگم : (آواز دے کر) او رضیہ کی بچی !

(رضیہ بھاگ کر آتی ہے)

رضیہ : جی !

بیگم : میں نے تجھ سے کہا نہیں تھا کہ بازار سے چینی لا کر دودھ میں ڈال لینا ۔ ڈالی نہیں ؟

رضیہ : جاتی ہوں امی !

بیگم : سردار ! ابھی چینی لائی ہی نہیں (خاں صاحب سے)

بتائیے بھائی جان ! اب میں کیا کروں ؟

جاوید : سفر ۔ صرف سفر ۔

بیگم : اللہ کرے میں تو اس دنیا سے سفر کر جاؤں ! جان چھوٹے اس مصیبت سے ۔

جاوید : سفر سے جان نہیں چھوٹ سکتی ! یہ انسان کا مقدر ہے ۔

میاں صاحب : لعنت ہے اس گھر پر ــــ

(گلاس دیوار کی طرف پھینکتے ہیں اور ''بھاڑ میں جائے تمہاری بلا سے '' کہتے ہوئے جانے لگتے ہیں)

جاوید : ملاحظہ فرمایا آپ نے ماموں جان ؟ ابھی دودھ گلاس میں تھا ، اب یہ سفر کرتا ہوا ــــ

بیگم : (منہ پر دوہتڑ مار کر) میں تو پاگل ہو جاؤں گی اس گھر میں ۔

(امجد آتا ہے)

امجد : امی ! باجی زور زور سے رو رہی ہیں ۔

جاوید : رونے دو ــــ سفر میں یہ مقام بھی آتا ہے ۔

(خاں صاحب جانے لگتے ہیں)

جاوید : ماموں جان ! آپ کہاں چلے ؟

خاں صاحب : سفر کر رہا ہوں ــــ

امجد : ماموں جان !

بیگم : بھائی جان !

جاوید ، امجد اور رضیہ (ایک ساتھ) ماموں جان ! ، ماموں جان ۔

(اس میں بیگم کی بھائی جان اور میاں صاحب کی بھائی صاحب کی آوازیں بھی شامل ھو جاتی ھیں ۔ ایک طوفان برپا ھو جاتا ھے ۔ اور خاں صاحب کانوں میں انگلیاں دئے بھاگنے لگتے ھیں پردہ جلدی سے گرتا ھے ۔)

—— : o : ——

کھڑکی

کردار:۔

○ شکیلہ
○ زبیر
○ راحت
○ اماں

منظر

ایک متوسط خاندان کا ڈرائنگ روم ۔

دیواروں پر تصویریں ۔ یہ تصویریں عموماً انسانی چہروں کی ہیں ۔ فرش پر دری ۔ درمیانی حصے میں قالین ۔ سامنے دیوار کے ساتھ انگیٹھی ۔ انگیٹھی کے اوپر دو خوبصورت گلدان مگر پھولوں سے محروم ۔

انگیٹھی سے کچھ دور بائیں جانب ایک کھڑکی ۔ دونوں پٹ کھلے ہوئے ۔ پس منظر میں آسمان کی نیلاہٹیں جو شام کی تاریکی اور دور تک پھیلے ہوئے ایک سلسلۂ کوہ کی سیاہی میں جذب ہو رہی ہیں ۔

انگیٹھی کے آگے قالین کے ایک سرے پر صوفہ سٹ ، اس کے علاوہ کرسیاں ، ایک تپائی ، ایک چھوٹی میز ۔ تپائی کے اوپر چائے کی ایک پیالی اور پلیٹ ۔ دونوں خالی ۔

ایک طرف کتابوں کی شیلف ۔

دائیں دیوار میں جو دروازہ نظر آتا ہے وہ برآمدے میں کھلتا ہے ، دوسرا دروازہ جو اس کے بالمقابل دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے آگے کوئی اور کمرہ ہے ۔ دونوں دروازوں پر پھولدار پردے پڑے ہیں ۔

کمرے کی فضا میں ایک خاص قسم کی آداسی کا احساس ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شام ہو رہی ہے

اور ابھی تک کمرے کے بلب روشن نہیں ہوئے ۔

کمرہ خالی ہے ۔

پردہ اٹھنے کے چند لمحوں بعد بائیں دروازے میں سے اماں اندر آتی ہے ۔ عمر ساٹھ سے اوپر ۔ پشت ذرا خمیدہ ۔

کمرے کے اندر آ کر وہ انگیٹھی کی طرف جاتی ہے ۔ شیلف کے پاس رک کر ، دیوار کے ساتھ لگا ہوا بجلی کا سوچ دبا دیتی ہے ۔ کمرے میں روشنی ہو جاتی ہے ۔ آگے بڑھ کر پیالی اور پلیٹ اٹھا لیتی ہے ۔ جانے لگتی ہے کہ یکایک اس کی نظر کھڑکی پر پڑتی ہے ۔ ادھر جاتی ہے ۔ ایک پٹ بند کر دیتی ہے ، دوسرا بند کرنے لگتی ہے کہ رک جاتی ہے اور پھر پہلا پٹ بھی کھول دیتی ہے ۔ دروازے کی طرف لوٹنے لگتی ہے کہ باہر سے ایک قہقہہ سنائی دیتا ہے ۔ وہیں ٹھہر جاتی ہے اور بائیں دروازے کو دیکھنے لگتی ہے ۔

زبیر اور شکیلہ آتے ہیں ۔

زبیر ، عمر قریباً تیس برس ۔ رنگ سفید ، نقش تیکھے تیکھے ۔ قد میانہ ۔ نیلے سوٹ میں ملبوس ، ایک ہاتھ میں تصویر اور دوسرے میں لفافہ ۔

شکیلہ لمبے اور چھریرے بدن کی خاتون ۔ زبیر سے عمر میں دو تین برس چھوٹی ۔ رنگ سانولا ۔ بال کٹے ہوئے ۔ کانوں میں لمبے آویزے ــــ سفید رنگ کی ساری پہنے ہوئے ۔ دائیں ہاتھ میں ایک ٹوکری جس میں پھولوں کے گلدستے نظر آ رہے ہیں ۔

اماں ان کی طرف آتی ہے ۔ پیالی اور پلیٹ تپائی پر رکھ دیتی ہے اور زبیر کے ہاتھ سے لفافہ لے لیتی ہے ۔ پھر شکیلہ کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے کہ اس سے ٹوکری لے لے ۔

شکیلہ : نہیں اماں ! ذرا ٹھہرو ۔

(شکیلہ گلدستے نکال کر خالی ٹوکری اماں کو دے دیتی ہے)

اماں : بڑی دیر لگا دی !

زبیر : کیا کیا جائے اماں! خرید و فروخت میں دیر ہو ہی جاتی ہے ۔

اماں: (مسکرا کر) خرید و فروخت !

(اماں گلدستوں کو دیکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خریدا کیا ہے)

زبیر : خریدا تو کچھ زیادہ نہیں ۔

شکیلہ : اور فروخت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

زبیر : فروخت کیا کرنا تھا ۔ در اصل ہمیں ڈاکٹر کے ہاں ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھنا پڑا ۔

(اماں جانے لگتی ہے)

میں نے کہا اماں !

(اماں جاتے جاتے رک جاتی ہے)

لفافے میں دوائیں ہیں ۔ اسے احتیاط کے ساتھ بی بی کی الماری میں رکھ دینا ! ۔۔۔اور اگر چائے مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی!

(اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے اور دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

شکیلہ : گلدستے رکھ دوں !

زبیر : جہاں تک میں سمجھتا ہوں ۔ یہ گلدستے خریدے ہی اس لیے گئے ہیں کہ انہیں گلدانوں میں سجا دیا جائے کوئی اور مصرف بھی ہے ان کا تو وہ میں نہیں جانتا !

شکیلہ : (مسکرا کر) اور مصرف کیا ہو سکتا ہے ؟

زبیر : شائد !

(شکیلہ انگیٹھی کی طرف جاتی ہے ۔ دونوں گلدستے گلدانوں میں رکھ دیتی ہے ۔ زبیر ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر اس انداز سے انگیٹھی کو دیکھتا ہے جیسے جائزہ لے رہا ہے)

واہ واہ انگیٹھی کی شان دوبالا ہو گئی ہے ۔

شکیلہ : آپ کا حسن نظر ہے ۔

زبیر : اور اب یہ تصویر ! اسے بھی رکھ دو !

(زبیر اسے تصویر دیتا ہے ۔ اس تصویر میں ایک قدرتی نظارہ دکھایا گیا ہے ۔ شکیلہ اس سے تصویر لے کر انگیٹھی کے درمیانی حصے میں رکھ دیتی ہے ۔ اس کے بعد لوٹنے لگتی ہے ۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر رک جاتی ہے ۔ دونوں پٹ بند کر کے صوفے کی طرف آتی ہے ۔ زبیر اسے گھور کر دیکھتا ہے)

شکیلہ : کیوں کیا بات ہے ؟

زبیر : یہ تم نے اچھا کیا ۔

شکیلہ : تصویر کے لیے یہی جگہ مناسب معلوم ہوتی ہے ۔

زبیر : تصویر کے لیے تو یہی جگہ مناسب ہے مگر میرا مطلب یہ تھا کہ تم نے اچھا کیا جو کھڑکی بند کر دی ، ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی ۔

(شکیلہ پیشانی پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیرنے لگتی ہے)

شکیلہ !

(شکیلہ کوئی جواب نہیں دیتی)

میں ایک پیشین گوئی کرنا چاہتا ہوں ۔ اگرچہ مجھے پیغمبری کا دعویٰ نہیں ہے اور نہ کبھی نجومی بننے کی کوشش کی ہے میں نے !

شکیلہ : پیشین گوئی !

زبیر : اسے پیشین گوئی بھی سمجھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ۔

شکیلہ : ہے کیا ؟

زبیر : یہ پیشین گوئی ہے کیا ! جناب عرض یہ ہے کہ چند روز تک آپ کی صحت قابل رشک ہو جائے گی جو دیکھے گا کہے گا کاش ایسی صحت مجھے بھی نصیب ہوتی ! وہ جو سنا ہے نا ۔ چندے آفتاب ، چندے مہتاب ۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہونے والا ہے ۔

شکیلہ : شکریہ ! شکریہ ! واقعی سچ کہہ رہے ہیں آپ ! ـــــ ہیں !

زبیر : آثار تو یہی کہہ رہے ہیں ۔ ماشاء اللہ چہرے پر شگفتگی برس رہی ہے ۔

(اماں ٹرے لے کر آتی ہے ۔ میز صوفے کے سامنے رکھ کر اس پر پیالیاں رکھ دیتی ہے ۔ تپائی پر سے خالی پیالی اور پلیٹ اٹھا لیتی ہے اور جانے لگتی ہے)

اماں !

اماں : جی !

زبیر : آج کی ڈاک ۔

اماں : اوہ ــــ

(جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالتی ہے اور اس کی تہ کھولنے لگتی ہے)

شکیلہ : تار معلوم ہوتا ہے ۔

زبیر : (تار لے کر پڑھتا ہے) Reaching monday by Mail.

شکیلہ : کون ؟

زبیر : راحت ۔

شکیلہ : کون راحت ۔

زبیر : میری ماموں زاد بہن ۔ نزہت سے تو تم مل چکی ہو نا ۔ وہ اس کی بڑی بہن ہے ۔ کچھ مدت سے انگلینڈ میں تھی ۔ چند ماہ ہوئے لوٹی ہے ۔

شکیلہ : گاڑی کس وقت پہنچتی ہے ؟

زبیر : چھ بجے ۔

شکیلہ ! اب تو ، (کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال کر) بتیس منٹ اوپر ہو چکے ہیں ۔

(شکیلہ چائے بنا کر شوہر کو دیتی ہے ۔ پھر اپنی چائے بنانے لگتی ہے ۔ اماں چلی جاتی ہے)

زبیر : سٹیشن پر جانے کا تو وقت نہیں رہا ۔

شکیلہ : یہاں آنے میں انہیں تکلیف ہو گی !

زبیر : تکلیف کیا ہوگی ۔ سڑک ، گھر کا نمبر وغیرہ جانتی

ہے ۔ آ جائے گی بلکہ آ رہی ہو گی ۔

(گھنٹی بجتی ہے)

شائد آ گئی ۔

(زبیر جلدی جلدی چائے کے گھونٹ حلق سے اتار کر بائیں دروازے کی طرف جاتا ہے ۔ شکیلہ چائے پیتی رہتی ہے ۔ پھر پیالی تپائی پر رکھ دیتی ہے اور کھڑی ہو جاتی ہے ۔ زبیر سوٹ کیس اٹھائے اندر آتا ہے ۔ اس کے پیچھے پیچھے راحت داخل ہوتی ہے ۔
راحت پیازی رنگ کی ساری میں ملبوس ہے ۔ لمبا قد ۔ عمر ۔ زبیر کی عمر جتنی۔ چہرے پر ایک خاص مسکراہٹ جس میں سنجیدگی زیادہ ہے)

راحت : (شکیلہ سے) سلام علیکم ۔

شکیلہ : وعلیکم السلام ۔ آئیے !

راحت : آ تو گئی ہوں ناخواندہ مہمان بن کر ۔

شکیلہ : ناخواندہ کیوں ۔ آپ کا اپنا گھر ہے ۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے کوئی دقت تو نہیں ہوئی آپ کو !

(زبیر سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیتا ہے)

زبیر : میں پہلے ہی معزرت کر چکا ہوں کہ سٹیشن پر نہیں پہنچ سکا !

شکیلہ : ہم دیر تک باہر رہے ۔ آپ کا تار ابھی ملا ہے ـــ سٹیشن پر جانے کا وقت نہیں تھا ۔

راحت : مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی ۔

(شکیلہ کو غور سے دیکھ کر)

ماشا اللہ ! بڑی پیاری دلہن ہے ۔

(شکیلہ شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

معاف کیجیے شکیلہ بہن ! میں شادی کے وقت یہاں تھی نہیں ۔

زبیر : میں بتا چکا ہوں !

راحت : شاید ایسی ہی شکل کے لیے کہا گیا ہے ، چندے آفتاب، ـــ !

شکیلہ : اب آپ زیادہ شرمندہ نہ کریں ، تشریف رکھیے !

(راحت صوفے پر بیٹھ جاتی ہے ۔ شکیلہ بھی اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

زبیر : چائے کے لیے ذرا کہہ دوں ۔

(زبیر بائیں دروازے میں سے نکل جاتا ہے)

راحت : خوب گذر رہی ہے نا ۔

شکیلہ : جی ہاں آپ کے بھائی جان نے مفصل تعارف نہیں کرایا آپ سے ۔

(شکیلہ سے مصافحہ کرتی ہے)

ایک عدد شوہر کی بیوی ہوں ، اور دو عدد بچوں کی ماں ۔

شکیلہ : اور !

راحت : اور ـــ؟ یہ کہ انگریزی کی لیکچرار ہوں

لڑکیوں کے کالج میں ۔ اپنی تو یہی کائنات ہے !

(زبیر دروازے میں سے داخل ہوتا ہے)

زبیر : اور ماہر نفسیات بھی ہوں۔ یہ کہنا بھول گئی ہو راحت !

شکیلہ : کیا ؟

راحت : کچھ نہیں ۔

زبیر : شکیلہ انہیں انسانی نفسیات سے غیر معمولی دلچسپی ہے ۔

راحت : ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ۔ بس ایک عام لیکچرار ہوں ۔

شکیلہ : کیا فرمایا آپ نے !

راحت : عرض یہ کر رہی ہوں کہ انگلینڈ سے لوٹی تو ایک مقامی کالج میں انگریزی پڑھانے لگی مگر وہاں مطمئن نہیں ہوں ۔ یہاں گورنمنٹ کالج کی پرنسپل نے بلایا ہے ۔

شکیلہ : آپ یہاں آ جائیں گی ! میرا مطلب ہے گورنمنٹ کالج میں ؟

راحت : فی الحال تو کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ انٹرویو ہوگا دو تین روز میں ! فیصلہ اس کے بعد ہوگا ۔

(اماں چائے کی ٹرے لے کر آتی ہے ۔ پیالیاں وغیرہ میز پر رکھنے لگتی ہے)

شکیلہ : انٹرویو کا کیا ھے !

راحت : ھر چند کہیں نہیں ھے—— ھے !

(شکیلا چائے بنانے لگتی ھے ۔ شکیلہ اور زبیر مسکراتے ھیں)

شکیلہ : کتنے چمچ !

راحت : ایک آدھ ڈال دیں ۔

شکیلہ : سفر کیسا رھا ؟

راحت : بڑا خوشگوار——

زبیر : اس سے یہ پوچھو کہ گاڑی میں کوئی نفسیاتی کیس تو نہیں ملا ۔

راحت : یہ نفسیاتی کیس بھی خوب رھا !

(شکیلہ پیالی میں دو چمچ چینی ڈال دیتی ھے)

معاف کیجیے ! پیالی آپ میرے لیے بنا رھی ھیں ؟

شکیلہ : جی ھاں ۔

راحت : آپ نے غالباً دو چمچ ڈال دئے ھیں ۔

زبیر : تو ایک چمچ اور ڈال دو ۔

راحت : (مسکرا کر) میری پیالی میں صرف ایک چمچ !

شکیلہ : Sorry ۔

(شکیلہ دوسری پیالی میں چینی کا ایک چمچ ڈالتی ھے)

راحت : شکریہ ! شاپنگ کیا کی ھے !

زبیر : وہ گلدستے خرید کر لائے ہیں اور تصویر بھی آج ہی خریدی ہے ۔

(راحت انگیٹھی کی طرف دیکھ رہی ہے)

آپ کو لینڈ سکیپ سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے ۔

(تینوں چائے پینے لگتے ہیں)

شکیلہ : یہ تصویر ان کی پسند کی ہے ۔

راحت : آپ کو قدرتی نظاروں سے دلچسپی نہیں ہے ۔

شکیلہ : ہر چند کہیں ہے ، نہیں ہے ۔

(سب مسکراتے ہیں)

زبیر : درست کہتی ہے ۔

راحت : سچ !

زبیر : کچھ ایسا ہی معاملہ ہے ۔ پہاڑ ، دریا وغیرہ اسے اچھے نہیں لگتے ۔

(شکیلہ اپنی پیالی میز پر رکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے)

راحت : کیوں ! کہاں جا رہی ہیں آپ ؟

شکیلہ : دیکھ آؤں ۔ باورچی خانے میں کیا ہو رہا ہے ۔

زبیر : کھانا پک رہا ہے ۔

شکیلہ : اماں کہیں پڈنگ کا ستیاناس نہ کر دے (راحت سے) معاف کیجئے ۔ ابھی واپس آتی ہوں ۔

(شکیلہ بائیں دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

زبیر : کیوں کوئی خاص بات دیکھی تم نے میری بیوی میں !

راحت : خاص بات کون سی !

زبیر : کوئی نفسیاتی الجھن ۔

راحت : نفسیاتی الجھن کس میں نہیں ہوتی ۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی الجھن ہوتی ہے ۔ آپ میں بھی ہے ، مجھ میں بھی ۔ اور شاید آپ کی دلہن میں بھی ۔

زبیر : تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے ۔

راحت : میں نے زیادہ غور نہیں کیا ۔ اور غور کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے ۔ معقول قسم کی خاتون ہیں ۔ ماشااللہ !

زبیر : اب تم اتفاق سے آ گئی ہو تو ذرا توجہ کرو !

راحت : کسی سے مشورہ لیا ہوتا آپ نے ۔

زبیر : کسی ماہر نفسیات کا نام لو تو بگڑ جاتی ہے ۔ کہتی ہے میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں ۔ عام نارمل انسان ہوں ۔ ماہر نفسیات کے پاس وہ جائے جو ابنارمل ہو ۔ کیا کروں مجبور ہو کر ڈاکٹر کے پاس ہی لے جاتا ہوں ۔ آج بھی ڈاکٹر کے پاس گئے تھے اور اس نے بہت سی دوائیں دے دی ہیں !

راحت : ڈاکٹر کیا کہتا ہے ۔

زبیر : کہتا ہے وٹامن کی بڑی کمی ہے ۔

(گفتگو کے دوران میں چائے کے گھونٹ بھرتے جاتے ہیں)

راحت : کمزور تو ہے نا۔

زبیر : بیمار رہی ہے۔ کئی ہفتوں کے بعد آج ہم بازار گئے ہیں اور جس ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے اس سے مزید دوائیں لے آئے ہیں!

راحت : بھائی جان! جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ اسے کوئی نفسیاتی بیماری ہے تو عام ڈاکٹر کا علاج کیا معنی رکھتا ہے۔

زبیر : اگر اس سے کہا جائے کہ تم میں کوئی نفسیاتی الجھن ہے تو برا مانتی ہے۔ ویسے تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟

(راحت دوسری پیالی بنانے لگتی ہے)

راحت : کیا اندازہ لگایا ہے!

زبیر : اندازہ تو ضرور لگایا ہوگا!

راحت : شاید۔

زبیر : تو پھر۔

راحت : میں آپ سے متفق ہوں۔ مگر میں سمجھتی ہوں اس قسم کے آثار عام نارمل انسانوں میں بھی ہوتے ہیں۔

زبیر : تکلف سے کام نہ لو۔ میں شکیلہ کی طرف سے کافی پریشان ہوں۔

راحت : حالاں کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے ۔ خیر یہ بتائیے آپ پریشان کیوں ہیں ؟

زبیر : میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ کچھ ابنارمل ہے ۔

راحت : وہ کیسے ؟ شادی کے بعد کوئی ناخوشگوار واقعہ ؟

زبیر : ہماری زندگی بڑے خوشگوار ماحول میں گزر رہی ہے ۔ شکر رنجی کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی ۔

راحت : کوئی اب نارمل حرکت دیکھی آپ نے ؟

(زبیر دو تین لمحے خاموش رہتا ہے ۔ پھر ایک لمبا گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھ دیتا ہے ۔ جیب سے سگرٹ اور لائٹر نکالتا ہے ۔ سگرٹ سلگاتا ہے اور کش لے کر کھڑکی کی طرف اشارہ کرتا ہے) ۔

زبیر : یہ کھڑکی دیکھ رہی ہو تم !

راحت : کیوں اس کھڑکی کو کیا ہے !

زبیر : اس کھڑکی کو اس کی ابنارمل زندگی سے گہرا تعلق ہے ۔

راحت : اس کا پتہ کس طرح چلا !

زبیر : یہ کھڑکی عام طور پر بند رہتی تھی ۔ میں اسے بند ہی دیکھتا تھا ۔ کبھی بند ہی رہنے دیتا تھا اور کبھی کھول دیتا تھا ۔ جب کھول دیتا تھا تو دوسرے دن پھر بند ہو جاتی تھی ۔ بات بالکل معمولی تھی ۔

میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی ۔ کمرے کی کھڑکی بند رہے یا کھلی اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ اماں سے کہتا تھا تم کھڑکی کیوں بند کر دیتی ہو مگر وہ کہتی تھی ۔ جی میں نے تو کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا (ذرا سا وقفہ) ایک شام کا ذکر ہے ۔ ہم میاں بیوی پکچر دیکھ کر آئے تو یہیں بیٹھ گئے ۔ اس دن بڑی گرمی تھی ۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی ۔ کچھ دیر کے بعد کھانا کھایا اور سونے کے لئے چلے گئے ۔ اس رات کو جو واقعہ ہوا وہ میرے لئے ایک معما بن گیا ہے ۔

راحت : کیا واقعہ ہوا ؟

زبیر : آدھی رات کے وقت صحن میں جو شور ہوا ، میری آنکھ کھل گئی ۔ دیکھا کہ شکیلہ باہر جا رہی ہے ۔ آواز دی مگر اس نے کوئی توجہ نہیں کی مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں بند ہیں ۔ حیرت ہوئی ! وہ صحن سے نکلی تو میں دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔ وہ ڈرائنگ روم میں گئی ۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کیے اور لوٹنے لگی ۔ میں جلدی سے واپس آ کر بستر میں لیٹ گیا ۔ وہ بھی آ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی ۔ اس وقت تو میں نے چپ سادھ لی ۔ صبح اس سے اس حرکت کے بارے میں پوچھا تو

اس نے صاف کہہ دیا کہ اسے تو کھڑکی کا کچھ علم ہی نہیں ہے !

راحت : کچھ علم ہی نہیں ہے !

زبیر : بالکل ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میں جب بھی کھڑکی بند دیکھتا تھا فوراً کھول دیتا تھا ۔ ایک دن جب اسے بند دیکھا تو اماں کو خوب جھاڑا کہ روز کھڑکی بند کر دیتی ہو ۔ معلوم نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے ۔

راحت : شکیلہ یہ باتیں سن رہی تھی ۔

زبیر : وہ دوسرے کمرے میں تھی ۔ مگر وہاں تک میری آواز بہ آسانی پہنچ سکتی تھی کہنا تو میں اسی سے چاہتا تھا لیکن کہہ رہا تھا اماں سے ۔ بعد میں مجھے اپنی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا ۔ ایک تو اماں کو بغیر کسی قصور کے برا بھلا کہا اور اس کا ردعمل جو شکیلہ پر ہوا وہ میرے لئے بہت تکلیف دہ تھا ۔ اس دن تو وہ چپ چپ رہی اور دوسرے دن بیمار ہو گئی اور آج کہیں جا کر اس کی صحت بحال ہوئی ہے ۔

راحت : کھڑکی تو اب بھی بند ہے ۔

زبیر : کھلی تھی مگر اس نے انگیٹھی پر گلدستے رکھتے ہوئے بے دھیانی میں بند کر دی ہے ۔

راحت : آپ نے خود بھی تو کچھ سوچا ہوگا ۔

زبیر : کھڑکی سے اسے کیا تعلق ھو سکتا ھے ؟

راحت : تعلق ھے جبھی تو اسے بند کر دیتی ھے ۔ یہ تعلق غیرشعوری معلوم ھوتا ھے ۔ کبھی آپ نے اسے کھڑکی سے باھر دیکھتے ھوئے پایا ھے ؟

زبیر : کبھی نہیں ۔

راحت : باھر کیا ھے ؟

زبیر : دیکھ لو ۔

(زبیر کھڑکی کے پاس آکر اس کے پٹ کھول دیتا ھے راحت بھی ادھر آتی ھے اور کھڑکی سے باھر دیکھنے لگتی ھے)

راحت : سامنے تو نمایاں چیز پہاڑ ھے ۔

زبیر : یہ پہاڑی سلسلہ دور تک چلا گیا ھے ۔

راحت : کمرے میں بیٹھو اور کھڑکی سے باھر نظر ڈالو تو ـــ

زبیر : (فقرہ مکمل کرتے ھوئے) یہ پہاڑی سلسلہ ھی دکھائی دیتا ھے ۔

راحت : آپ کبھی اس پہاڑ پر سیر کرنے گئے ھیں ۔

زبیر : شکیلہ کے ساتھ ؟

راحت : ھاں ۔

زبیر : کبھی نہیں ۔ البتہ پہاڑ کے قریب سے ضرور گزرے ھیں ۔

راحت : آپ نے کبھی اسے اوپر جانے کے لئے کہا ھے ۔

زبیر : وہ پہاڑ پر چڑھتی نہیں تھی ۔

راحت : کیا کہتی تھی ؟

زبیر : کہتی تھی ـــ بہت تھک جاتی ہوں ۔

راحت : ویسے اس کی کوشش کیا ہوتی تھی ۔

زبیر : کس کے بارے میں!

راحت : وہ تفریح کے لئے پہاڑ پر جانا پسند کرتی تھی یا نہیں ۔

زبیر : میرا خیال ہے نہیں ـــ شہر کے باہر جو باغات ہیں وہاں جانا پسند کرتی ہے آج بھی ہم کچھ دیر وہیں گھومتے رہے ہیں ۔

راحت : شادی سے پہلے شکیلہ کہاں رہتی تھی ۔ میری مراد یہ ہے کہ اس کا میکہ کہاں ہے؟

زبیر : یہاں سے کچھ دور نہیں ہے ۔ وہ دیکھو ـــ سامنے ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دے رہی ہے نا ۔ یہ نہر کا پانی ہے ۔ اسی کے کنارے شکیلہ کے والدین رہتے ہیں ۔

راحت : آپ نے اس سلسلے میں اس کے بہن بھائیوں سے کبھی کچھ کہا بھی ہے ؟

زبیر : کبھی نہیں ۔

(شکیلہ اندر آتی ہے انہیں کھڑکی کے پاس دیکھ کر کچھ ٹھٹک جاتی ہے ۔ خاموش رہتی ہے ۔ زبیر مڑ کر دیکھتا ہے)

شکیلہ! آ گئیں تم!

(راحت کھڑکی سے ہٹ جاتی ہے)

راحت: (مسکرا کر) میں دیکھ رہی تھی کہ باہر کہاں تک آبادی چلی گئی ہے۔

شکیلہ: آئیے کھانا لگ دیا ہے۔

زبیر: اچھا چلو راحت۔

راحت: چلئے۔

(شکیلہ واپس چلی جاتی ہے۔ راحت کھڑکی بند کر دیتی ہے اور زبیر کے پیچھے پیچھے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ اسی حالت میں پردہ گرتا ہے۔)

دوسرا منظر

ڈرائنگ روم: روشنی پہلے کے مقابلے میں مدھم رہے گی۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو راحت اور شکیلہ صوفے پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔

راحت: بھائی جان تو شاید چلے گئے۔

شکیلہ: کہتے تھے ایک فنکشن پر جانا ہے۔

راحت: آپ جلدی سو جانے کے عادی تو نہیں۔

شکیلہ: دس گیارہ تو بج ہی جاتے ہیں۔

راحت: میں تو بارہ سے پیشتر بستر پر جاتی ہی نہیں۔ اور پھر نیند فوراً نہیں آتی۔

شکیلہ: بستر پر لیٹ کر کیا کرتی رہتی ہیں۔

راحت : نیند لانے کا آسان نسخہ یہ ہے کوئی سخت بور قسم کی کتاب پڑھنے لگیں۔ ہر روز تو نہیں کبھی کبھی یہی نسخہ استعمال کرتی ہوں۔ آپ کیا کرتی ہیں۔

شکیلہ : کچھ نہیں۔

راحت : کچھ پرانی باتیں یاد آتی ہوں گی۔

شکیلہ : پرانی باتیں۔

راحت : بچپن کے قصے۔

شکیلہ : جی نہیں۔ آپ کافی تو پئیں گی نا۔

(اٹھنے لگتی ہے)

راحت : آپ اماں سے کہہ آئی ہیں کافی بنا کر لے آنا کہ لے آئے گی وہ

شکیلہ : اوہ خیال نہیں رہا۔

(شکیلہ بیٹھ جاتی ہے)

راحت : (ادھر ادھر نظریں ڈالتے ہوئے) ڈرائنگ روم تو آپ نے خوب سجا رکھا ہے۔ تصویروں کا انتخاب خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو لینڈ سکیپ سے زیادہ انسانی چہروں سے دلچسپی ہے۔

شکیلہ : نہیں قدرتی نظاروں سے بھی دلچسپی ہے۔

راحت : کس قسم کے نظاروں سے۔

شکیلہ : کوئی قسم مخصوص نہیں ہے ۔

راحت : یعنی تمام نظاروں سے جن میں درخت آبشار ، دریا چشمے ، باغ واغ اور پہاڑ شامل ہیں ۔

شکیلہ : جی ہاں ۔

راحت : میں ابھی ابھی (کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے) دیکھ رہی تھی ۔ بڑا اچھا منظرنظر آیا تھا ۔ آپ تو اکثر دیکھتی رہتی ہوں گی ۔

شکیلہ : کبھی کبھی ۔

راحت : اس وقت تو منظر بڑا اچھا لگا تھا ۔ معلوم نہیں ۔ اب رات کے اندھیرے میں کیسا دکھائی دیتا ہے ستاروں کی مدھم روشنی میں ۔ ذرا دیکھوں ۔

شکیلہ : آپ دیکھئے ۔ میں ذرا کافی ——

راحت : کافی آجائے گی آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں ۔

(راحت کھڑکی کے پاس جاکر اس کے پٹ کھولتی ہے ۔ شکیلہ صوفے کے پاس کھڑی رہتی ہے ۔ راحت باہر دیکھتی ہے ۔)

بڑا خوبصورت منظر ہے ۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں کائنات بڑی پراسرار نظر آتی ہے ۔ ہر شے پر ایک سحر سا چھایا ہوا ہے معلوم نہیں یہ منظر بہت اچھا ہے یا مجھے بہت اچھا نظر آتا ہے ۔ کیوں شکیلہ !

(شکیلہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے)

میں نے کہا ذرا آئیے تو ۔

(شکیلہ ابھی تک وہیں ہے)

شکیلہ : میں بارہا دیکھ چکی ہوں ۔

راحت : اجنبی نظاروں میں ایک عجیب حسن ہوتا ہے جو دل کو لبھانے بغیر نہیں رہتا ۔ میرے لئے تو یہ ماحول کچھ اجنبی سا ہے آپ کے لئے نہیں ۔ کیوں (مڑ کر شکیلہ کو دیکھتی ہے) ارے ۔ آپ وہیں کھڑی ہیں ۔ ہوا زیادہ ٹھنڈی تو نہیں ہے ۔

شکیلہ : یہ بات نہیں ۔

راحت : پھر کیا بات ہے ۔

شکیلہ : کوئی بھی تو بات نہیں ۔

(شکیلہ ادھر جانے لگتی ہے)

راحت : دیکھئے تو ـــــ

شکیلہ : (کھڑکی سے ذرا فاصلے پر رک کر) جی!

راحت : نیم تاریکی اور نیم روشنی میں ڈوبی ہوئی فضا کتنی پراسرار معلوم ہوتی ہے ۔ خاموشیوں کے گہوارے میں کتنے طوفان آسودۂ خواب ہیں ۔ ستاروں کا کارواں نہ جانے کس منزل کی طرف رواں دواں ہے ۔ یہاں ازل اور ابد کا امتیاز مٹ جاتا ہے ۔ زندگی اور موت کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں ہوتا ۔

(شکیلہ کو دیکھ کر اور مسکرا کر)

کیسی باتیں کہہ رہی ہوں میں ۔ آپ سوچتی ہوں گی عجب شاعرانہ مزاج کی عورت ہے یہ !

شکیلہ : شاعرانہ مزاج میں آخر کیا برائی ہے ۔

راحت : کیا برائی ہوگی ؟ صحیح کہا آپ نے !

(اماں کافی لے کر آتی ہے ۔ پیالیاں وغیرہ تپائی پر رکھ کر تپائی شکیلہ کے پاس لے جاتی ہے)

راحت : شکیلہ ! یہ بتائیے ۔ جب آپ ایسا منظر دیکھتی ہیں تو آپ کے ذہن کی کیا کیفیت ہوتی ہے ۔

شکیلہ : کیا کہوں ؟

(شکیلہ کافی بنانے لگتی ہے)

راحت : میرے دل و دماغ پر تو ایک جنون خیز کیفیت چھا جاتی ہے ۔ آپ کی حالت تو ایسی نہیں ہوتی ۔

(شکیلہ کافی بناتی رہتی ہے)

ویسے شکیلہ ! ایسی کیفیت میں ایک خاص لطف بھی ہوتا ہے ۔

(شکیلہ کافی لے کر راحت کے پاس آتی ہے)

شکریہ ۔ (کافی لیتے ہوئے) بہت بہت !

(شکیلہ اپنی پیالی بھی اٹھا لیتی ہے)

میں نے کہا وہ دیکھئے ۔

(شکیلہ اس کے قریب ہو جاتی ہے)

شکیلہ : کہیے!

راحت : وہ سامنے کیا ہے؟

شکیلہ : کہاں! — وہ — آسمان کی پھیلی ہوئی سیاہی ہے۔

راحت : (گھونٹ لے کر) اس کے نیچے۔ میرا خیال ہے پہاڑ ہے۔

شکیلہ : ہاں۔

(شکیلہ کافی پینے لگتی ہے)

راحت : آپ کا آبائی مکان بھی وہیں کہیں ہے۔

شکیلہ : نہر کے کنارے!

راحت : تو بچپن آپ کا اسی کے قریب و جوار میں گزرا ہے۔ اس زمانے میں آپ ضرور وہاں جایا کرتی ہوں گی۔

شکیلہ : کہاں!

راحت : وہاں۔ پہاڑ پر؟

شکیلہ : دراصل مجھے سیر و تفریح کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ گھر ہی میں بیٹھی رہتی تھی۔ ہمارے گھر کے آگے کافی لمبا چوڑا میدان ہے۔

راحت : گھر کے سامنے میدان کتنا بھی لمبا چوڑا کیوں نہ ہو۔ پہاڑ آخر پہاڑ ہے۔ میں بتاؤں آپ کو — میرا مکان بڑے پرفضا مقام پر واقع ہے مگر میں بچپن میں گھر سے دور ان کھیتوں میں بڑے شوق سے جایا کرتی تھی جو آبادی سے کافی دور تھے۔ آج بھی ان کھیتوں کا خیال آتا

ہے تو ایک دم کئی پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

(شکیلہ سر جھکا کر کافی پیتی رہتی ہے)

شکیلہ: کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔

راحت: (مسکرا کر) میں چائے گرم اور کافی ٹھنڈی پیتی ہوں ہے نہ ایک عجیب عادت! آپ کا کیا خیال ہے۔

شکیلہ: اچھی عادت ہے۔

راحت: آپ اسے اچھی عادت کہتی ہیں۔ خوب!

(کافی کا ایک گھونٹ لے کر باہر دیکھتی ہے)

کاش! میرا بچپن یہاں گزرا ہوتا اور آج جب میں اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھتی تو نہ جانے مجھے کیا یاد آ جاتا۔ بچپن کی یادیں بہت سہانی ہوتی ہیں۔

(شکیلہ کی طرف دیکھے بغیر) آپ کیا سوچ رہی ہیں؟

شکیلہ: سوچنا کیا ہے۔

راحت: شکیلہ!

شکیلہ: ہوں۔

راحت: کبھی بچپن میں اکیلی بھی پہاڑ پر گئی ہیں؟

شکیلہ: یاد نہیں پڑتا!

راحت: سہیلیوں کے ساتھ تو اکثر جایا کرتی ہوں گی۔

شکیلہ: بہت کم۔

راحت: مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار میں اور میرا ہمسایہ

لڑکا سام کے وقت آخری کھیت میں جا پہنچے تھے۔ یہ آخری کھیت میرے گھر سے کوئی ڈیڑھ میل دور ہو گا وہ ڈرنے لگا۔ اور اسے ڈرتے دیکھ کر میں بھی ڈر گئی۔ لگتا تھا ایک سایہ سا ہمارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ آج بھی جب یہ واقعہ آنکھوں کے سامنے بھرنے لگتا ہے تو دل میں خوف کا ایک مبہم سا احساس جاگ اٹھتا ہے میرا خیال ہے آپ کو کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔

شکیلہ : نہیں!

راحت : آپ کو کوئی واقعہ یاد نہیں آتا! (مڑ کر شکیلہ کو دیکھتے ہوئے) کوئی صورت، کوئی آواز— کچھ بھی یاد نہیں آتا آپ کو!

شکیلہ : ایک آواز۔

راحت : جو دور کہیں گونج اٹھی ہو گی۔ جیسے میں نے سنی تھی۔ میں سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں سے لوٹ رہی تھی۔ دور کسی درخت پر کوئی پرندہ بولا۔ یہ آواز سیدھی میرے دل میں اتر گئی۔ آپ نے کونسی آواز سنی تھی؟

شکیلہ : یہ آواز—

راحت : کسی پرندے کی تھی کیا۔

شکیلہ : ایک چیخ تھی۔

راحت : چیخ !

شکیلہ : معاف کیجئے ! میں بھی کیا قصہ لے بیٹھی ہوں ۔

راحت : چیخ کس کی شکیلہ بہن !

شکیلہ : کچھ نہیں — چلئے ۔ آئیے صوفے پر بیٹھیں ۔

(راحت اس کا ہاتھ پکڑتی ہے)

راحت : میرے اندر تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہے ۔ آپ کچھ بتائیں گی نہیں تو ذہن میں ہمیشہ ایک خلش رہے گی ۔

شکیلہ : وہ !

راحت : چیخ کس کی؟

شکیلہ : ایک چیخ اور پھر اندھیرے میں لہو ۔

راحت : آپ کے ساتھ کوئی تھا؟

شکیلہ : میں تنہا رہ گئی تھی ۔

راحت : چیخ کس کی تھی — لہو کس کا تھا ؟

شکیلہ : میں نہیں جانتی — مجھے کچھ خبر نہیں ۔ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں — میں کچھ نہیں جانتی ۔

(شکیلہ ایک دم پیچھے ہٹ جاتی ہے ۔ پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑتی ہے ۔ اور وہ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے ۔ دونوں ہاتوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے ۔ راحت اس کی طرف آتی ہے !)

راحت : (لہجے میں ملائمت) شکیلہ !

(شکیلہ کوئی جواب نہیں دیتی)

شکیلہ!

شکیلہ: مجھے چھوڑ دیجئے۔

راحت: شکیلہ!

شکیلہ: اوہ ــــ

(شکیلہ چہرے سے ہاتھ ہٹاتی ہے۔ گھور کر راحت کو دیکھتی ہے)

راحت: میں جانتی ہوں آپ کو ایک ناگوار واقعہ یاد آ رہا ہے۔ شاید وہ واقعہ کچھ اس قسم کا ہے۔ آپ تنہا پہاڑ پر جا رہی ہیں اتنے میں ایک چیخ بلند ہوتی ہے۔ آپ ڈر کر تیزی سے اترنے لگتی ہیں اتنے میں کوئی زخمی جانور آپ کے سامنے آتا ہے اور پل بھر میں غائب ہو جاتا ہے۔

(شکیلہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے بیٹھی ہے۔ راحت کرسی میں بیٹھ کر پیالی تپائی پر رکھ دیتی ہے)

شکیلہ: نہیں۔

راحت: کیا آپ نے کسی زخمی جانور کو دیکھا تھا؟

شکیلہ: نہیں۔

راحت: تو لہو کس کا تھا؟

شکیلہ: اُس کا۔

(شکیلہ دونوں ہاتھوں سے چہر ڈھانپ لیتی ہے)

راحت: کون تھا وہ۔

شکیلہ : اُس نے کہا تھا چلو پہاڑ پر چلیں ۔ میں نہیں جانا چاہتی تھی ۔ مگر وہ مجھے مجبور کر کے لے گئی ۔

راحت : آپ کی سہیلی؟

شکیلہ : ہم دونوں چل پڑے ۔

راحت : تم اور تمہاری سہیلی ۔

شکیلہ : شام ہو چکی تھی ۔ اندھیرا پھیل رہا تھا ۔ ہمارے قدم آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے ۔ پہاڑ کے پاس پہنچ کر میں نے اس سے کہا ۔ چلو رضیہ واپس چلیں ۔ مگر وہ نہ مانی ۔ کہنے لگی نہیں ہم اوپر جائیں گے ۔ میں پہاڑ پر چڑھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے مجبور کرنے پر چڑھنے لگی ۔ پھر وہ بولی ۔ دیکھیں پہلے اوپر کون جاتا ہے اور وہ بھاگ کر اوپر جانے لگی میں بھی بھاگنے لگی ۔ دونوں بھاگ رہی تھیں؟

راحت : اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا؟

شکیلہ : نہیں کوئی نہیں تھا ۔

راحت : تم دونوں بھاگنے لگیں ۔

شکیلہ : ہاں کبھی وہ پیچھے رہ جاتی تھی اور میں آگے نکل جاتی تھی ۔

راحت : اور کبھی وہ آگے نکل جاتی تھی اور تم پیچھے . . .

شکیلہ : ایک جگہ وہ مجھ سے آگے نکلنے لگی تو ــ

(شکیلہ خوموش ہو جاتی ہے)

راحت : تو !

شکیلہ : میں اسے پکڑنا چاھا اور پکڑ لیا ۔

(ذار خاموش ھو جاتی ھے)

اور۔۔وہ۔۔ وہ نیچے جا رھی تھی ۔ میں نے اسے دھکا دے دیا تھا ۔ اور میرے اللہ ۔

(شکیلہ بے اختیار سسکیاں لینے لگتی ھے اور چہرہ ھاتھوں سے چھپا لیتی ھے)

راحت : شکیلہ !

شکیلہ : اس کی چیخ گونجی اور وہ نظروں سے غائب ھوگئی ۔

راحت : تم وھیں کھڑی تھیں ۔ حیران پریشان ۔

شکیلہ : میں اس کی طرف بھاگی ۔ پھر۔۔۔پھر۔۔۔

راحت پھر !

شکیلہ : میں نے اسے دیکھا وہ نیچے پتھروں کے درمیان پڑی تھی ۔ لہو لہان ۔ لمبے لمبے سانس لے رھی تھی اور۔۔

(فقرہ مکمل کرنا چاھتی ھے مگر سسکیاں غالب آجاتی ھیں ۔ ابھی تک اس کے ھاتھ چہرے پر ھیں ۔)

راحت : شکیلہ !

شکیلہ : مجھے چھوڑ دو ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو !

راحت : نہیں شکیلہ ۔

شکیلہ ۔ جاؤ۔ خدا کے لئے چلی جاؤ۔ چلی جاؤ۔

(راحت اس کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے اور اس پر جھک جاتی ہے)

راحت : شکیلہ بہن! پریشان کیوں ہوتی ہو شکیلہ! شکیلہ!

(شکیلہ سسکیاں لیتی رہتی ہے)

کوئی ایسی بات نہیں ہے ۔ دل قابو میں رکھو۔ تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو ۔

(شکیلہ کی سسکیاں رک جاتی ہیں)

چہرے سے ہاتھ ہٹالو پگلی ۔ بالکل پگلی ہو ۔

(شکیلہ چہرے سے ہاتھ ہٹا لیتی ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں)

بول شاباش!

(شکیلہ بزبان خاموشی پوچھ رہی ہے بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو)

میں نے کہا ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے ۔

شکیلہ : میں نے اسے دھکا دیا تھا ۔

راحت : نہیں شکیلہ! نہیں!

شکیلہ : وہ ۔۔۔ وہ (آگے کچھ نہیں کہہ سکتی ۔ خلا میں کھوئی سی لگتی ہے)

راحت: اٹھو ذرا۔ اٹھو نا شکیلہ!

(شکیلہ اٹھتی ہے)

آؤ میرے ساتھ!

شکیلہ : کہاں ۔

راحت : میرے ساتھ آؤ تو سہی!

(راحت اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کے پاس لے آتی ہے)

دیکھو شکیلہ! وہ دیکھ رہی ہو نا پہاڑ!

(شکیلہ اثبات میں سر ہلاتی ہے)

یہ پہاڑ، جس سے تم خوف زدہ ہو، نہ جانے کب سے کھڑا ہے ۔ ہزاروں کیا لاکھوں برس اس پر گزر چکے ہیں ۔ اس مدت میں ان گنت لوگ یہاں آئے ہیں اور نہ جانے کتنے راز اس کی سنگین دیواروں کے حوالے کر کے چلے گئے ہیں ۔ انہی رازوں میں تمہارا وہ ننھا سا راز بھی ہے ۔ یہ پہاڑ ان رازوں کو چھپائے کھڑا ہے اور ابد تک یونہی کھڑا رہے گا ۔ اس کے ہونٹوں کو کبھی جنبش نہیں ہو گی ۔ یہ کبھی نہیں بولے گا ۔ خاموش ہی رہے گا جیسے اس کے سینے میں کچھ نہیں ہے ۔ ان رازوں کی دنیا کے گرد اس نے اپنی لمبی لمبی سنگین دیواریں کھڑی کی ہوئی ہیں ۔ کوئی شخص بھی ان دیواروں کی درزوں میں سے اندر نہیں جھانک سکتا ۔ سمجھ رہی ہو نا ۔

شکیلہ : ہاں!

راحت : پہاڑ کے لئے رازوں کا بوجھ کوئی بوجھ نہیں ہے ۔ اس کے سینے کی وسعتوں میں کئی کروڑ اور راز بھی

سما سکتے ھیں ۔ مگر انسان تو ایک محسوس کرنے والی ، بولنے والی ۔ رونے اور ھسنے والی ھستی ھے ۔ اس کے دل میں اس طرح رازوں کی سمائی شاید ممکن نہیں ھے ۔ تم نے کبھی ساحل پر جا کر سمندر کو متلاطم حالت میں دیکھا ھے ۔ لہریں اٹھتی ھیں اور جو کچھ سمندر کی تاریک گہرائیوں میں چھپا ھوتا ھے ان لہروں کے ذریعے باھر آ جاتا ھے ۔ اس طرح سمندر اپنے راز ساحل کو بتا دیتا ھے اور یوں اس کا بوجھ ھلکا ھو جاتا ھے ۔ انسان کی بھی یہی حالت ھوتی ھے ۔

(راحت ذرا خاموش رھتی ھے ۔)

تم نے اپنا راز خود سے بھی چھپانے کی کوشش کی ھے ۔ بچپن سے مسلسل یہی کوشش کرتی چلی آئی ھو ۔ مگر تم انسان ھو ، پہاڑ نہیں ھو ــــ ! ! راز کو خود سے چھپانے کی کوشش میں تم نے اپنی شخصیت کو دو حصوں میں بانٹ لیا ھے ۔ ایک شخصیت وہ ھے جسے یہ راز معلوم ھے ۔ دوسری وہ جو اس راز سے بھاگنا چاھتی ھے ۔ دوسری شخصیت پہلی شخصیت سے دور رھنا چاھتی ھے ۔ متواتر بھاگ رھی ھے ۔ مگر بھاگ نہیں سکتی ۔ بھاگ کر آخر جائے گی کہاں ــ اس کا نتیجہ یہ ھوا ھے کہ بچپن کی ایک معصوم شرارت تمھارے لئے ایک جرم بن گئی ھے ۔ تم نے خود

کو مجرم بنالیا ہے ۔

شکیلہ : مگر جو کچھ ہوا؟

راحت : وہ تمہاری صرف ایک اضطراری حرکت تھی ۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ اس پر تم قادر نہیں تھیں ۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں ۔ ہم فانی انسانوں کا ان کھیلوں سے کیا تعلق ۔۔۔ ؟

(شکیلہ کا چہرہ قدرے پر سکون ہو گیا ہے)

پہاڑ کو بھی قدرت کے ان کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ اسے انسانوں سے دلچسپی ہے ۔ صرف انسانوں سے ۔۔ وہ آج بھی تمہارا اسی محبت سے خیر مقدم کرے گا جس محبت سے تمہارے بچپن میں کیا کرتا تھا ۔ آزما کر دیکھ لو ۔۔ کیا خیال ہے؟

شکیلہ : خیال؟

راحت : صبح وہاں چلیں گے!

شکیلہ : کہاں؟

ارحت : وہاں ۔۔ پہاڑ پر ۔

(راحت مسکرا کر شکیلہ کو دیکھتی ہے ۔ شکیلہ نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا ۔ دائیں دروازے کا پردہ ہٹا کر زبیر آتا ہے ۔ راحت اور شکیلہ کی اس پر نظر نہیں پڑی ۔ زبیر آگے بڑھ کر ان کے قریب آ جاتا ہے ۔ راحت اسے دیکھتی ہے ۔)

راحت : آ گئے آپ؟

زبیر : ہاں۔ کیا ہو رہا ہے؟

راحت : پروگرام بن رہا ہے !

زبیر : کیسا پروگرام!

(اس دوران میں شکیلہ خاموش رہتی ہے ۔ اس کی نگاہیں دروازے پر جمی ہیں)

راحت : صبح کی سیر کا ۔ ہم (کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے) ادھر پہاڑ پر جا رہے ہیں ۔

زبیر : (مسکرا کر) واقعی!

راحت : کیوں وہاں جانے میں کیا حرج ہے ـــ کیوں شکیلہ!

(زبیر اور راحت ، دونوں شکیلہ کو بیک وقت دیکھتے ہیں ۔ شکیلہ کوئی جواب نہیں دیتی ۔

دو تین لمحے دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے)

زبیر : شکیلہ!

راحت : جی!

زبیر : راحت کیا کہہ رہی ہے ۔

شکیلہ : ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں ۔

(زبیر اور راحت مسکراتے ہیں)

زبیر : ٹھیک!

(شکیلہ شوہر کو دیکھتی ہے آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگتی ہے اور اسی حالت میں پردہ گرتا ہے)

دستک

کردار :-

- ○ ڈاکٹر زیدی
- ○ بیگم زیدی
- ○ ڈاکٹر برہان

منظر

ڈاکٹر زیدی کا کمرہ ۔

ڈاکٹر صاحب پلنگ پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں ۔ عمر پچپن کے لگ بھگ ۔ فرنچ کٹ داڑھی ۔ چہرے پر نقاہت نمایاں ۔ اس وقت انہوں نے کمبل لپیٹ رکھا ہے ۔ پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر مختلف شیشیاں ۔

رات طوفانی ۔ تیز و تند ہوا کا مستقل شور ہوتا رہتا ہے

بیگم زیدی آرام کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کا مطالعہ کر رہی ہیں ۔ عمر پچاس کے قریب ۔

سردی کی وجہ سے شال اوڑھ رکھی ہے ۔

ڈاکٹر کچھ سوچتے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں ۔ یکایک ان کی نظر سامنے دروازے پر جا پڑتی ہے ۔ جس پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے ۔

بیگم انہیں دیکھتی ہیں ۔ اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگتی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے ہیں مگر بہت آہستہ ۔ صرف ان کے ہونٹ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ پھر کمبل اپنے جسم سے ہٹانے لگتے ہیں ۔

بیگم کی نظر پڑتی ہے ۔

بیگم : کیا ہے زیدی؟

زیدی : دستک سنی؟

بیگم : دستک!

زیدی : سنی نہیں تم نے؟

(ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ رک جاتے ہیں)

بیگم : ہو تو سنوں بھی! کہاں ہے دستک؟

زیدی : کہاں ہے دستک؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ دیکھو تو جا کر۔ کوئی آیا ہے دروازے پر۔ کوئی کھٹکھٹا رہا ہے دروازہ!

بیگم : کوئی نہیں!

زیدی : صاف آواز آ رہی ہے۔ نہیں جانا چاہتیں تو میں خود—

(ڈاکٹر صاحب کمبل ہٹانے لگتے ہیں۔
بیگم رسالہ کرسی پر رکھ کر اٹھتی ہیں اور ان کی طرف آتی ہیں)

بیگم : کیا کر رہے ہیں آپ!

زیدی : دیکھتا ہوں دروازے پر کون ہے۔ تم تو جاتی ہی نہیں!

بیگم : مہربانی کر کے بیٹھے رہئے! دروازے پر کوئی بھی نہیں۔

زیدی : تو یہ دستک؟!

(بیگم ان کے گرد کمبل لپیٹنے لگتی ہے)

بیگم : تیز ہوا کا شور ہے۔

زیدی : تیز ہوا دروازے پر دستک دیا کرتی ہے! تم جا کے دیکھو تو ذرا ۔

بیگم : میں کہتی ہوں کوئی نہیں ہے ۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں!

زیدی : ذرا سنو تو ۔ صاف ۔ بالکل صاف ـــــ دستک نہیں تو اور کیا ہے؟

بیگم : آپ کا وہم ہے!

زیدی : دیکھو اب زیادہ زور سے ہونے لگی ہے ۔ یہ وہم ہے کیا ؟

(پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بیگم ان کا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں)

بیگم : خدا کے لئے لیٹے رہئے! آپ تو خود ڈاکٹر ہیں ۔ ڈاکٹر ہو کر ایسی حرکتیں کر رہے ہیں! اپنی حالت کا ذرا خیال کریں !

زیدی : تم ایک مرتبہ جا کر دیکھ نہیں آئیں !

بیگم : میں جانتی ہوں دروازے پر کوئی نہیں ۔ خیر دیکھ آتی ہوں ۔

(یوں سر کو جنبش دیتی ہیں جیسے اس کام کو بے کار سمجھ رہی ہیں ۔ دروازے کی طرف جاتی ہیں ۔ زیدی انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں ۔ بیگم پردے کے پیچھے چلی جاتی ہیں دو تین لمحوں کے بعد پردے سے باہر آتی ہیں ۔)

زیدی : کون ہے؟

بیگم : کون ہوگا ؟

(بیگم واپس آتی ہیں)

زیدی : تم نے دروازہ کھولا تھا؟

بیگم : (ذرا غصے سے) تو کیا دروازہ کھولے بغیر ہی کہہ رہی ہوں ۔ نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے آپ کو ۔ کوئی آئے گا تو کیا کال بل نہیں دیکھے گا۔ دروازے پر ہی دستک دے گا ۔

(ڈاکٹر اور بیگم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر کی نظروں میں بے اعتباری سی ہے اور بیگم کی نظروں میں شکایت)

زیدی ۔ مگر یہ دستک !

بیگم : (الفاظ کاٹتے ہوئے) آپ آرام نہیں کریں گے —— ڈاکٹر ہو کر —— !

زیدی : (بیوی کے الفاظ کاٹ کر) بار بار مجھے کیوں بتا رہی ہو کہ میں ڈاکٹر ہوں ۔

بیگم : وہ اس لئے کہ آپ کو عام لوگوں سے بالکل مختلف ہونا چاہئے ۔ اگر ڈاکٹر بھی کسی واہمے کا شکار ہو جائے تو پھر اس کے علم کا کیا فائدہ ؟

زیدی : شاید تم سچ ہی کہتی ہو ۔

بیگم : (آواز میں نرمی) آپ خود ہی بتائیے ایک ڈاکٹر ،

حقیقت پسند نہیں ہو گا تو اور کون ہو گا ؟

زیدی : دروازے پر دستک کی آواز سننا حقیقت کے خلاف ہے ؟

بیگم : جب دستک ہی نہ ہو اور اصرار کریں کہ آواز سنی ہے اس وقت آواز سننا کس طرح حقیقت ہوئی ۔

(ڈاکٹر سر جھکا کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں ۔ بیگم انہیں دیکھتی رہتی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی نظریں بے اختیار سامنے پردے پر پڑتی ہیں ــ تیز و تند ہوا کا شور بڑھ گیا ہے ۔ شاید بارش شروع ہو گئی ہے)

آپ لیٹ جائیں نا ۔

(ڈاکٹر صاحب اپنے خیال میں غرق ہیں)

میں نے کیا کہا ؟

زیدی : کیا کہا؟

بیگم : لیٹ جائیے !

زیدی : تم نے دروازہ کھول کر دیکھا تھا نا؟

بیگم : حد ہو گئی ہے ۔ آپ لیٹ کیوں نہیں جاتے ۔ آدھی رات ہوچکی ہے ابھی تک جاگ رہے ہیں ۔ ڈاکٹر برہان نے کہا نہیں تھا آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے !

زیدی : یہ بات میں خود نہیں جانتا؟

بیگم : کیوں نہیں جانتے۔ جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔ ڈاکٹر برہان نے کہا تھا میں خود آکر دوا پلاؤں گا۔ یاد نہیں رہا اسے اب تو صبح ہی آئے گا۔

زیدی : اچھا لڑکا ہے۔

بیگم : میں نے اتنا ذمہ دار اور فرض شناس نوجوان آج تک نہیں دیکھا۔ سوائے کام کے اسے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ہر وقت کام۔ دن ہو یا رات! کام کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں! یہ ہے فرض شناسی!

زیدی : ڈاکٹر کو فرض شناس ہی ہونا چاہئے!

(یہ لفظ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب پھر سامنے پردے کو دیکھنے لگتے ہیں)

بیگم : آپ پھر — تو یہ ہے —— ڈاکٹر برہان آئیں گے تو کہوں گی ان سے!

زیدی : کیا کہو گی؟

بیگم : یہ بھی تو ایک بیماری ہے، دروازے پر کوئی ہے نہیں اور آپ ہیں کہ دستک کی آواز سن رہے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا ہے۔

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

زیدی : اب تو آیا ہے کوئی!

بیگم : شاید ڈاکٹر برہان ہیں!

(بیگم دروازے کی طرف جاتی ہیں اور پردے کے پیچھے

غائب ہوجاتی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد جب باہر نکلتی ہیں تو ان کے ساتھ ڈاکٹر برہان بھی آتے ہیں۔

ڈاکٹر برہان عمر کے لحاظ سے بالکل نوجوان ہیں۔ ہاتھ میں ڈاکٹروں والا بیگ۔ برساتی پہن رکھی ہے)

برہان : (دور ہی سے) سلام علیکم، ڈاکٹر صاحب۔

زیدی : و علیکم اسلام۔ بڑی تکلیف کی بیٹا! اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی۔ صبح دیکھا جاتا۔

برہان : کوئی بات نہیں۔

بیگم : ہاں بیٹا! اس وقت بھلا کیا ضرورت تھی آنے کی۔

برہان : آج شام سے پہلے دو کیس ایسے آگئے کہ فرصت ہی نہ ملی، بڑا مصروف رہا۔

(برہان آگے بڑھتے ہیں۔ بیگ چھوٹی میز پر رکھ دیتے ہیں)

کہئے ٹمپریچر؟

بیگم : تھوڑی دیر پہلے لیا تھا۔ سو (۱۰۰) ہے۔

برہان : سینے میں تو درد نہیں؟

زیدی : نہیں۔

برہان : شکر ہے۔ اور کوئی بات؟

بیگم : گھبراہٹ سی ہے۔

برہان : کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے انجکشن میں ناغہ کر دیا جائے۔

زیدی : یہ ٹھیک ہے۔

(بیگم جلدی سے بائیں دروازے میں سے دوسرے کمرے میں
چلی جاتی ھیں ۔ برھان ایک بوتل اٹھاتے ھیں)

برھان : سیرپ ختم ھوگیا ھے ۔ کل آؤں گا تو لے آؤں گا ۔

زیدی : تو آپ چلے؟

برھان : جی ھاں ۔

بیگم : (دوسرے کمرے سے) ڈاکٹر صاحب!

برھان : جی !

بیگم : ذرا ٹھہرئے ۔

برھان : مجھے جلدی ھے ذرا ۔

بیگم : ایک دو منٹ چائے لا رھی ھوں ۔

برھان : او ھو آپ نے کیوں تکلیف کی؟

(بیگم آتی ھیں)

بیگم : آپ تو اتنی سردی میں آئے ھیں ۔ برساتی اتار دیجئے ۔

(برھان برساتی اتار کر کرسی کے بازو پر پھیلا دیتے ھیں ۔
بیگم چلی جاتی ھیں ۔)

زیدی : بیٹھ جائیے ۔

(برھان کرسی پر بیٹھ جاتے ھیں)

برھان : اور تو کوئی تکلیف نہیں؟

(بیگم ٹرے میں چائے کی تین پیالیاں لے کر آتی ھیں)

بیگم : میں بتاتی ھوں ڈاکٹر صاحب :

(ٹرے برھان کی طرف بڑھاتی ھیں ۔ وہ ایک پیالی اٹھا لیتے

ہیں ۔ بیگم دوسری پیالی شوہر کو ، اور تیسری پیالی اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر خالی لوٹے جھک کر میز کے ساتھ لگا دیتی ہیں)

برہان : (گھونٹ لے کر) آپ کیا بتا رہی تھیں؟

بیگم : ڈاکٹر صاحب! یہ بات بتاتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے ۔ شاید آپ اس پر یقین نہیں کریں گے مگر ۔

(شوہر کی طرف دیکھتی ہیں جو نگاہیں جھکائے چائے پینے میں مصروف ہیں)

برہان : فرمائیے تو۔

بیگم : انہیں ایک وہم ہو گیا ہے ۔

برہان : وہم!

بیگم : (مسکرا کر) آپ کہیں گے ڈاکٹر اور وہم — یہ کیا بات ہوئی!

برہان : جی میں نہیں کہوں گا ۔ میں جانتا ہوں انسانی فطرت بڑی پراسرار ہوتی ہے ۔ اور ڈاکٹر بھی تو آخر انسان ہی ہوتا ہے ۔

(بیگم ایک بار پھر شوہر کو دیکھتی ہیں وہ بدستور چائے پینے میں مصروف ہیں)

بیگم : چائے پیجئے نا ۔

برہان : بہتر ۔

(برہان پیالی ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں ۔ بیگم بھی چائے پیتی ہیں)

بیگم : پتا نہیں کیا بات ہے ۔ بیٹھے بیٹھے خیال کرنے لگتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے ۔ حالانکہ دروازے پر کوئی بھی نہیں ہوتا ۔

برہان : ہوسکتا ہے کسی نے دروازے پر ہی دستک دی ہو اور آپ نے نہ سنی ہو!

بیگم : دستک ہوتی ہی نہیں میں کیسے مان لوں ۔

برہان : یعنی دستک نہیں ہوتی اور ڈاکٹر صاحب محسوس کرتے ہیں کہ دستک ہو رہی ہے؟

بیگم : جی ہاں !

برہان چائے کے دو گھونٹ پی کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں ۔ زیدی نے پیالی خالی کردی ہے ۔ بیگم ہاتھ بڑھا کر پیالی لے لیتی ہیں اور میز پر رکھ دیتی ہیں ۔ زیدی نے اپنا سر دیوار سے لگا دیا ہے اور آنکھیں بند کئے لیٹے ہیں ۔)

برہان : نیند آ رہی ہے ڈاکٹر صاحب؟

زیدی : (آنکھیں کھولے بغیر) جی نہیں ۔

بیگم : آج انہیں بار بار یہ خیال آیا ہے ۔ میں نے کہا بھی کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے اس کی وجہ سے یہ شور ہو رہا ہے مگر مانتے ہی نہیں ــ دو مرتبہ دروازے پر بھجوایا ہے ۔

زیدی : اور وہاں کوئی نہیں تھا؟

بیگم : کوئی بھی نہیں ۔

زیدی : اچھا !

بیگم : آپ ان سے پوچھئے ۔

(زیدی آنکھیں کھول دیتے ہیں)

زیدی : برہان بیٹا !

برہان : کہیے !

زیدی : یہ آج سے اٹھارہ بیس برس پہلے کا واقعہ ہے اس زمانے میں میری پریکٹس خوب چلتی تھی ۔ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی ، ڈسپنسری اور گھر پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔ ایک رات میں دیر سے گھر پہنچا اور پہنچتے ہی بستر پر گر پڑا ، بری طرح تھک چکا تھا ۔

(برہان پیالی میز پر رکھ دیتے ہیں ، بیگم پیالی ہاتھ میں لئے شوہر کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہیں)

کچھ دیر بعد میرے نوکر نے آ کر بتایا کہ ایک بڑے میاں آئے ہیں اور آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں ، میں نے انکار کر دیا اور نوکر سے کہا کہ بڑے میاں کو واپس بھیج دو مگر اس کے روکنے کے باوجود وہ بوڑھا میرے کمرے میں آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرا بیٹا سخت بیمار ہے پہلے

بوی آپ کی دوا سے شفا ہوئی تھی ۔ چل کر دیکھ لیں مگر میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں ۔

(زیدی دو تین لمحوں کے لئے خاموش رہتے ہیں ۔ پھر کہنے لگتے ہیں)

گرم بستر چھوڑنا بڑا مشکل نظر آ رہا تھا ۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا ۔ وہ بولتا رہا اور جب نوکر نے اسے زبردستی باہر نکال دیا تو دروازے پر دستک دینے لگا ۔ نہ جانے کب تک دستک دیتا رہا ۔ میں سو گیا ۔

(زیدی پھر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ بیگم کی نگاہیں اپنے شوہر پر جمی ہیں اور برہان میز سے دوائی کی ایک شیشی اٹھا کر اسے دیکھ رہے ہیں)

صبح اٹھا تو طبیعت پر بڑا بوجھ تھا ۔ افسوس کر رہا تھا کہ میں نے بوڑھے کو کیوں مایوس کیا ۔

برہان : اس وقت آپ کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا ۔

زیدی : بس یہی بات تھی میں نے اس بوڑھے کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی مگر کہیں پتہ نہ چلا نہ جانے وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا ؟

برہان : وہ بوڑھا تو چلا گیا ۔ مگر اب کبھی کبھی آپ کا ضمیر دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے ۔

(برہان بوتل میز پر رکھ دیتا ہے)

یہ دوا آج ختم ہو جانی چاہئے تھی ۔

(زیدی خاموش رہتے ہیں برہان برساتی اٹھا کر پہن لیتے ہیں۔ اور بیگ اٹھا کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں۔)

ڈاکٹر صاحب!

زیدی : کہو بیٹا!

برہان : اس واقعے میں ایک بات کا اضافہ کر لیجئے۔ میں انہیں بڑے میاں کا پوتا ہوں جس کا بیٹا اس رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا تھا ـــــ

زیدی : تم ـــ!

بیگم : برہان بیٹا؟

برہان : اچھا خدا حافظ! ڈاکٹر صاحب اطمینان کے ساتھ سو جائیے! اب دروازے پر دستک نہیں ہونی چاہئے آرام کیجئے۔ شب بخیر۔ کل حاضر ہوں گا۔

(برہان دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور جلدی سے پردے کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے)۔

زیدی اور بیگم اسے خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔

(برہان کے پردے کے پیچھے جاتے ہی پردہ گر جاتا ہے)

— o —

روشنی والا

کردار :۔

- ○ راحیل
- ○ زرینہ
- ○ اندھا
- ○ بوڑھا
- ○ لڑکا
- ○ دراز قامت
- ○ پست قامت
- ○ ایک مرد
- ○ ایک عورت

منظر

جب پردہ اٹھتا ہے تو تمام اسٹیج گھورے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے ۔ دو تین لمحے گزر جاتے ہیں ۔ اس کے بعد اندھیرے کے سینے میں ایک مردانہ آواز دھڑکنے لگتی ہے دوسری آواز عورت کی ہے

پہلی آواز : بارالہا ! اب تو روشنی بھیج دے ! یہ اندھیرے تو ہمارے دلوں اور روحوں میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں ۔ ہماری آنکھیں اپنی بصارت کھو کر پتھر کے ٹکڑے بن گئی ہیں ۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں رک سی گئی ہیں ۔ ہماری دنیا ایک وسیع ، دہشت ناک اور غیر محدود قبرستان بن گئی ہے ۔ بارالہا ! مدتیں بیت گئیں ۔ کہیں سے بھی کوئی شعاع نہیں پھوٹی ۔ کہیں سے بھی کوئی کرن نہیں آبھری ! جہاں تہاں، آفق تا افق اندھیرا ہی اندھیرا ـــــ پھیلا ہوا ہے ۔ اے خدا ! کیا تیری کائنات سے روشنی کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے ؟ کیا یہ تاریکیاں تا ابد چھائی

رہیں گی ؟ اے خالق کائنات! اب تو روشنی بھیج دے !۔۔۔اب تو روشنی بھیج دے!!

(مردانہ آواز کا فقرہ مکمل ہوتا ہے تو دوسری آواز سنائی دیتی ہے)

دوسری آواز : دعا کرتے کرتے تمہاری زبان نہیں تھکتی؟

پہلی آواز : (لہجے میں ایک واضح تیقن) روشنی آئے گی ۔

دوسری آواز : کب؟

پہلی آواز : (بلند) روشنی ضرور آئے گی؟

دوسری آواز : جھوٹ ۔ خود فریبی! روشنی کو آنا ہوتا تو اس وقت آتی جب وہ میری گود سے نکل کر اندھیروں کے سمندر میں ڈوب گیا تھا ۔ اس کی آخری چیخیں ابھی تک میرے دل میں گونج رہی ہیں ۔

پہلی آواز : بار الہا ! اب تو روشنی بھیج دے ۔

دوسری آواز : میں نے کس طرح رو رو کر دعائیں مانگی تھیں۔۔ اے خدا صرف چند لمحوں کے لئے روشنی بھیج دے تا کہ میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو ڈھونڈ کر اپنی گود میں اٹھالوں۔۔مگر تاریکیوں کی لہریں اور بلند ہو گئیں ۔ وہ نہ جانے کن کن پاؤں کے نیچے آ کر دب گیا ۔ کہاں سسک سسک کر مر گیا ۔ اس نے کس طرح اور نہ جانے کہاں سے آخری بار ماں کہا تھا ۔ اور پھر یہ آواز سنائی نہیں دی!

پہلی آواز : تم دعا میں میرے ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتیں

دوسری آواز : روشنی نہیں آئے گی ۔

پہلی آواز : آئے گی ۔ ضرور آئے گی ۔

(کسی قدر فاصلے پر تیسری آواز سنائی دے گی ۔ اس آواز میں گرج کی سی کیفیت ہے)

تیسری آواز : روشنی آئے گی ۔ ہونہہ ۔

پہلی آواز : اندھے! تم ہماری باتوں میں مت دخل دو !

تیسری آواز : کیا پاگل پن ہے ۔ تم پاگل ہوگئے ہو !

پہلی آواز : تم کیا جانو روشنی کیا ہوتی ہے؟

تیسری آواز : (زور دار قہقہہ) پاگل ہو ۔ بالکل پاگل ہو ۔

دوسری آواز : اندھا غلط نہیں کہتا ۔ روشنی نہیں آ سکتی!

پہلی آواز : زرینہ ! آج میرا دل بری طرح دھڑک رہا ہے ۔

دوسری آواز : راحیل تمہارے کان بج رہے ہیں ۔

پہلی آواز : نہیں!

(پہلی آواز میں یک لخت جزبے کی شدت اور جوش پیدا ہو جاتا ہے)

وہ دیکھو! زرینہ! وہ دیکھو!!

دوسری آواز کیا؟

(دور اندھیرے میں ایک کرن سی نمودار ہو رہی ہے)

پہلی آواز : میں نہ کہتا تھا روشنی آئے گی!

تیسری آواز : دھوکا۔بہت بڑا دھوکا ! دل بہلاؤ اور

سو جاؤ — کچھ نہیں ! تم کچھ نہیں کر سکتے !

(روشنی واضح صورت اختیار کر کے آگے بڑھ رہی ہے)

پہلی آواز : دیکھا تم نے !

دوسری آواز : یہ کیا ہے

پہلی آواز : روشنی ! روشنی !! روشنی !!!

دوسری آواز : روشنی !

پہلی آواز : آگئی ۔ روشنی آگئی ۔ میری دعائیں قبول ہوگئیں روشنی آگئی !

دوسری آواز سچ روشنی آگئی ۔

پہلی آواز : تم دیکھ نہیں رہیں؟

دوسری آواز : مجھے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہیں !

تیسری آواز : اندھیرا اردگرد اور وسیع ہو گیا ہے ۔

پہلی آواز : نہیں یہ روشنی ہے !

تیسری آواز : (طنزاً) ہاں روشنی ہے ۔ روشنی کا ایک سیلاب آ رہا ہے —— پاگل پن ۔ ہونہہ !

(روشنی اور آگے بڑھ جاتی ہے ۔ اب اس روشنی میں سٹیج کا پس منظر نمایاں ہوگیا ہے درختوں ، پہاڑوں اور بلند عمارتوں کے ہیولے اجاگر ہوگئے ہیں ۔)

پہلی آواز : آؤ روشنی کا خیر مقدم کریں !

(روشنی مسلسل بڑھ رہی ہے ۔ دو سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں)

دوسری آواز : ٹھہرو راحیل! مجھ سے بھاگا نہیں جاتا۔

تیسری آواز : موت کے مہیب غار کی طرف جا رہے ہو! رک جاؤ! رک جاؤ!!

پہلی آواز : (دور سے) زرینہ! میری زرینہ!!

دوسری آواز : راحیل!!

(روشنی سٹیج کے درمیانی حصے میں پہنچ گئی ہے۔ کچھ پودے نظر آتے ہیں)

پہلی آواز : آج کا دن کتنا مقدس ہے!

دوسری آواز : ہاں!

(روشنی سٹیج پر پھیل گئی ہے۔ اس طرف جہاں سے روشنی آگے آ رہی ہے۔ ایک نحیف و نزار شخص عام رفتار سے قدم اٹھا رہا ہے۔

اس کے سینے پر ایک لالٹین دکھائی دے رہی ہے۔

لالٹین کا شیشہ بڑا صاف ہے۔ شیشے کے اندر ایک شعلہ روشنی اگل رہا ہے۔ یہ شعلہ خاص طور پر تیز اور توانا معلوم ہوتا ہے۔

اس شخص کے دونوں ہاتھوں نے لالٹین کے دونوں پہلوؤں کو تھام رکھا ہے۔ یہ روشنی والا، دراز قد انسان ہے۔ چہرہ گردآلود جس پر زخموں کے جا بجا نشان نظر آ رہے ہیں۔ اور داڑھی کے بال الجھے ہوئے — گرد غبار کی وجہ سے بالوں کا رنگ معلوم نہیں ہوتا۔ طویل سفر کی وجہ سے پاؤں سوجے ہوئے ہیں۔ جن سے لہو بہہ رہا ہے۔

وہ ایک لمبے چغے میں ملبوس ہے۔

چہرہ اگرچہ گرد آلود ہے۔ تاہم اس پر ایک نا قابل بیان جلال چھایا ہوا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ نہیں نکلے گا۔ کبھی کبھی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی

شفقت آمیز مسکراہٹ آ جائے گی ۔

اب روشنی ایک وسیع دائرے کی صورت میں ہر طرف پھیل گئی ہے ۔

اور جو درخت کھڑے دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ بے برگ و بار ہیں پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلتا چلا گیا ہے ۔

سٹیج ایک ایسے مقام کا نقشہ پیش کر رہی ہے جسے شاہراہ بھی کہا جاسکتا ہے اور میدان بھی ۔

اب روشنی والا ایک چھوٹے سے چبوترے کے اوپر کھڑا ہے ۔ اس سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب ایک میز کے گرد آمنے سامنے دو کرسیاں پڑی ہیں ۔ اسے راحیل اور زرینہ ، کا ”گھر“ سمجھنا چاہیے ۔

روشنی والے کے پیچھے ایک کھلی جگہ پر دو تین پودے دکھائی دے رہے ہیں ۔ یہ پودے راحیل اور زرینہ کے ”کھیت“ کی نمائندگی کر رہے ہیں ۔

روشنی والے کے ایک طرف راحیل کھڑا ہے ۔ جسے اندھیرے میں پہلی آواز کہا گیا تھا ۔ اس کے پہلو میں زرینہ ہے جو دوسری آواز تھی ۔

راحیل درمیانہ قد و قامت کا دبلا پتلا آدمی ہے ، ایک لمبے کرتے میں ملبوس ، ٹانگیں ننگی ۔ داڑھی بڑھی ہوئی عمر پینتیس اور چالیس کے لگ بھگ ۔

زرینہ درمیانہ قد و قامت کی عورت ۔ سر کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے ۔ چہرے کے نقوش میں ایک خاص جاذبیت شوہر کی طرح ایک لمبا کرتہ پہنے ہوئے ۔ یہ کرتا شوہر کے کرتے سے زیادہ لمبا ہے ۔ عمر تیس کے قریب ۔

دونوں نے پاؤں میں چپل پہن رکھے ہیں ۔

ان سے کچھ فاصلے پر اندھا کھڑا ہے — یہ تیسری آواز تھی ۔ جب تک ڈرامے کا عمل جاری رہے گا ۔ اندھا زیادہ تر سٹیج

پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتا رھے گا ۔ اس کے ھاتھ میں ایک موٹی لاٹھی ھے ۔ پاؤں میں کھڑاؤں ھے ۔ جب وہ چلتا ھے تو مسلسل ٹھک ٹھک کی آواز آتی رھتی ھے ۔ راحیل روشنی والے کے قریب ھو جاتا ھے)

راحیل : تم کہاں تھے اب تک ۔ ھم نے سالہا سال تک تمہارا انتظار کیا ھے ۔

(روشنی والا کوئی جواب نہیں دیتا ۔ صرف اثبات میں سر ھلا دیتا ھے ۔)

اب کہیں چلے تو نہیں جاؤ گے؟

زرینہ : راحیل! اس کے چہرے کو دیکھو ۔

راحیل : نہ جانے کتنی لمبی مسافت طے کر کے آیا ھے؟

زرینہ : چہرے پر زخموں کے نشان بھی ھیں ۔

(زرینہ روشنی والے کا جائزہ لیتی ھے ۔ اس کی نگاھیں پاؤں پر پڑتی ھیں ۔)

ھائے پاؤں ۔

راحیل : کتنی مٹی جمی ھے ان پر !

زرینہ : سوجے ھوئے ھیں ۔ لہو بھی رس رھا ھے ۔

راحیل : یہ روشنی والا ھے ۔ روشنی پھیلاتا ھے ۔

زرینہ : مگر اسے یہ کیسی سزا مل رھی ھے ۔

راحیل : یہ راز کی باتیں ھیں ۔ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ۔

زرینہ : میں صاف کر دوں اس کے پاؤں ؟

(زرینہ بیٹھ کر کرتے کے دامن سے روشنی والے کے پاؤں صاف کرنے لگتی ہے ۔ روشنی والا نفی میں سر ہلاتا ہے جیسے اسے اس کام سے منع کر رہا ہے ۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر آ جاتے ہیں ۔)

راحیل : درد ہوتا ہے ۔

زرینہ (سر اٹھا کر) کیا ہے راحیل؟

راحیل : بے چارے کو درد ہوتا ہے ۔

(زرینہ کھڑی ہو جاتی ہے)

زرینہ : جی چاہتا ہے نہلا دھلا کر اسے نئے کپڑے پہناؤں ۔ اس کے بالوں میں کنگھی کروں ۔ ہائے یہ تو ـــ راحیل دیکھو ذرا ۔

(زرینہ انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگتی ہے)

راحیل : (اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے) مت پریشان کرو اسے

زرینہ : بے چارا ۔

راحیل : (آہ بھر کر) ہاں بے چارا ۔

(اندھا جو کسی قدر دور کھڑا ہے ۔ ان کی طرف آنے لگتا ہے)

اندھا : یہ کیا ہو رہا ہے؟

راحیل : روشنی والا آ گیا ہے ۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی ہے ۔ روشنی !

اندھا : روشنی ۔ (زور دار قہقہہ لگا کر) ہونہہ پاگل پن !

راحیل : اندھے تم کچھ نہیں سمجھ سکتے ۔ تم کیا جانو ۔ کائنات میں دوبارہ زندگی آ گئی ہے ۔ روشنی آنے سے

پہلے ہم تاریک غاروں میں سانس لے رہے تھے۔ اب ہماری دنیا میں پھیلاؤ ہے۔ خوبصورتی ہے۔ رنگینی ہے۔ اندھیرے ختم ہو گئے۔ روشنی آ گئی!

اندھا : پاگل پن!

راحیل : آؤ—ادھر آؤ۔

(اندھا ذرا تیزی سے قدم اٹھانے لگتا ہے۔ ان کے پاس پہنچتا ہے۔ راحیل اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور یہ ہاتھ لالٹین کی طرف لے جاتا ہے۔)

سمجھتے ہو یہ کیا ہے؟

اندھا : کوئی سخت چیز گرم، گرم۔ آگ! اوہ چھوڑ دو میرا ہاتھ!

(راحیل اس کے ہاتھ کو لالٹین سے ہٹا دیتا ہے۔ مگر اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتا ہے)

راحیل : یہ کائنات کی روح ہے۔

اندھا : روح—ہونہہ۔

راحیل : یہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے—اور یہ ہے روشنی والا۔

(راحیل اندھے کا ہاتھ روشنی والے کے چہرے کی طرف لے جاتا ہے)

یہ ہے ہمارا حسن، زندگی کا حسن، کائنات کا حسن!

اندھا : نہیں!

(اندھا غصے سے اپنا ہاتھ ہٹا لیتا ہے)

راحیل : تم کیا جانو ۔ اندھے بے وقوف!

اندھا : (گرج کر) تم پاگل ہو ۔

(زرینہ ہلکا سا قہقہہ لگاتی ہے)

زرینہ : ہمیں کہتا ہے پاگل!

اندھا : تم چپ رہو ، جلادماں ہو ۔

(یکایک زرینہ کی کیفیت بدل جاتی ہے)

زرینہ : میرا بچہ —— راحیل!

(زرینہ جیسے تڑپ کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے)

راحیل! راحیل!!

اندھا : کھونے والے سب کچھ کھو دیتے ہیں اور پھر کھوئی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈتے ہیں اور —— (قہقہہ لگا کر) اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں ۔ انسان پاگل ہے ۔

زرینہ : اور تم انسان نہیں ہو؟

اندھا : مجھے پاگل انسانوں سے نفرت ہے —— نفرت —— شدید نفرت ۔

(اندھا زور دار قہقہہ لگا کر سٹیج کے دوسرے کنارے کی طرف جانے لگتا ہے ۔ اور راحیل زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف قدم اٹھانا شروع کر دیتا ہے ۔
سٹیج کے کوہستانی گوشے سے ایک خمیدہ قامت بوڑھا

آتا ہے ۔ دائیں ہاتھ میں ایک کتاب جس کی جلد سنہری ہے ۔ دوسرے ہاتھ میں ایک قلمدان ۔

داڑھی نہ زیادہ لمبی ۔ نہ زیادہ چھوٹی ۔ سفید براق سی ۔ لباس ایک چمکتا ہوا چغہ ۔ آنکھوں پر عینک ۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا ہے ۔

راحیل اور زرینہ اسے دیکھتے ہیں ۔ ایک لمحے کے لئے رک جاتے ہیں اور پھر جانے لگتے ہیں ۔)

زرینہ : راحیل یہ کون ہے !

راحیل : پتا نہیں کون ہے !

(بوڑھا اس طرح چلا جا رہا ہے جیسے گرد و پیش سے بالکل بے نیاز ہے ۔ راحیل اور زرینہ دونوں کرسیوں میں بیٹھ جاتے ہیں ۔

بوڑھا روشنی والے کے سامنے آ جاتا ہے اور اس سے مخاطب ہوتا ہے ۔)

بوڑھا : اب یہاں آ گئے ہو !

(روشنی والا صرف ایک لمحے کے لئے اسے دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے ۔)

لوگ تمہارے چہرے پر زخم لگاتے ہیں ۔ تمہیں ٹھکراتے ہیں تمہارے ہونٹوں سے زہر کا پیالہ لگا دیتے ہیں ۔ تمہارے سر پر آرے چلاتے ہیں ۔ دار پر کھینچتے ہیں ۔ مگر تم ہو کہ کسی بات کی بھی پروا نہیں کرتے ۔ مرتے ہو اور پھر زندہ ہو جاتے ہو ۔ زندہ ہو جاتے ہو ۔ اور پھر لوگ تمہیں ٹھکرا دیتے ہیں ۔ تمہارا

سفر کب ختم ہوگا ، شاید کبھی نہیں !

(بوڑھا اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے)

تمہیں خبر نہیں کہ انسان کتنا سفاک اور محسن کش درندہ ہے ۔ کیوں نہیں اسے اندھیروں میں تڑپنے دیتے جانتے نہیں یہ انسان پہلے تمہارے پاؤں چومتا ہے اور پھر اپنے پنجوں سے تمہارا چہرہ لہولہان کر دیتا ہے ۔

(بوڑھا فرط تاثر میں اپنا سر ہلاتا ہے)

کس قدر بے وقوف ہو تم — ! مگر مجھے کیا ۔ میرا کام تو صرف یہ ہے کہ تم جن راستوں سے گزرو اور جو کچھ تمہیں پیش آئے ۔ اس کی تفصیل لکھ دوں ۔ پچھلے دنوں جب میں نے تمہیں دیکھا تم تاریک براعظم کے ایک گوشے میں زندگی کی روشنی اٹھائے گھوم رہے تھے ۔ اور جابجا گھوم کر اپنی قوم کو بیداری کا پیغام سنا رہے تھے ۔ تمہارے سینے سے شعلوں کا ایک سیلاب آمڈ پڑا تھا ۔ جس میں غلامی کی تاریکیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی تھیں ۔ لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ غیروں نے سازش کی اور تمہارے اپنوں نے تمہیں مار ڈالا — اور آج پھر تم جی اٹھے ہو — ہزاروں میل طے کر کے ، جسم پر

بے شمار زخم کھا کے یہاں آ گئے ہو۔ لیکن میں یہ کیا کہہ رہا ہوں ——؟ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

(بوڑھا بیٹھ کر قلمدان کھول کر ایک پر والا قلم نکال کر اس سے کتاب میں کچھ لکھنے لگتا ہے۔
زرینہ راحیل کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر یک لخت اٹھ بیٹھتی ہے اور بوڑھے کی طرف آنے لگتی ہے۔
بوڑھا کچھ لکھ کر قلم —— قلم دان میں رکھنے لگتا ہے۔ کتاب بند کرتا ہے اور اٹھ بیٹھتا ہے۔
زرینہ اس کی طرف قدم اٹھا رہی ہے۔
اب وہ وہاں آ چکی ہے۔ راحیل بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے)

زرینہ : بابا!

بوڑھا : (درشتی سے) کون ہو تم؟

زرینہ : میں زرینہ —— وہ میرا شوہر راحیل —— یہ ہمارا گھر —— وہ ہمارا کھیت!

بوڑھا : خوش قسمت ہو۔

زرینہ : نہیں! اندھیرے میں میرا بچہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ کس طرح پاؤں اپنا بچہ!

(بوڑھا ہنستا ہے۔ چلتے چلتے رک جاتا ہے)

اندھا : کون عقل مند آدمی آیا ہے پاگلوں کی دنیا میں!

(بوڑھا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا)

بوڑھا : انسان اپنے آپ کو کھو چکا ھے اور تو اپنے کھوئے ھوئے بیٹے کی بات کر رھی ھے ۔

زرینہ : کہاں گیا ـــ کیا مر گیا ؟

بوڑھا : انسان مر گیا!

زرینہ : میرا بیٹا!

بوڑھا : ستاروں پر کمندیں پھینک رھا ھے ۔ چاند کی طرف پرواز کر رھا ھے ـــ اور گندے تاریک گلی کوچوں میں ھزاروں لاکھوں چاند پاؤں تلے کچلے جا رھے ھیں ۔

زرینہ : ھائے میرا بیٹا! کس ظالم نے کچلا میرے پھول کو ؟

بوڑھا : میں انسان کی بات کر رھا ھوں کسی شاعر سے کہو کہ وہ تمہارے بیٹے کا مرثیہ لکھ دے ۔ مجھے تو انسان کا مرثیہ لکھنا ھے کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر!

(راحیل بھی وھاں آ چکا ھے)

راحیل : بابا!

(بوڑھا جا رھا ھے ۔ راحیل اور زرینہ اسے جاتے ھوئے دیکھ رھے ھیں)

چلو اپنے کھیت میں چلیں ۔

(زرینہ کا غم تازہ ھو گیا ھے وہ گم سم کھڑی ھے ۔)

دیکھو کتنا خوبصورت لگتا ہے ہمارا کھیت!

زرینہ : کیا کہتے ہو ۔ کہاں ہے وہ !

راحیل : اپنا کھیت بھول گئیں؟

زرینہ : کھیت؟ ہاں ۔

راحیل : چلو ۔ چلیں ۔

(راحیل زرینہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور دونوں کھیت کی طرف جانے لگتے ہیں)

اندھا : ایک بار قہقہہ بلند ہوا۔۔۔پھر نہیں ہوا ۔ کوئی عقلمند آدمی آیا اور چلا گیا!

راحیل : خاموش بد بخت!

اندھا : عقلمند وہ ہے جو اس دنیا پر پوری شدت سے قہقہے لگاتا ہے آہاہاہا۔۔۔ہاہا ۔

(اندھا قہقہے پر قہقہہ لگاتا ہے ۔ یہ قہقہہ کھڑاؤں کی ٹھک ٹھک میں مل کر خاصا وحشت ناک ہو جاتا ہے ۔)

راحیل : خاموش ہو جاؤ ۔

(راحیل اتنی زور سے یہ فقرہ کہتا ہے کہ اندھا سہم سا جاتا ہے
راحیل اور زرینہ کھیت ، میں پہنچ گئے ہیں)

زرینہ : فصل تباہ ہو گئی!

راحیل : کھیت تو سلامت ہے نا ؟

زرینہ : کھیت کوئی بچہ ہے کہ کہیں کھو جاتا !

راحیل : (کھیت میں بیٹھ کر) اب ہم دونوں اسے صاف کریں گے ۔ پھر دوبارہ اس کے سینے میں بیج بوئیں گے ۔ زمین کی تہوں میں بیج پرورش پائیں گے ۔ روشنی انہیں زندگی دے گی ۔ فصل لہلہا اٹھے گی ۔ جو زندگی چلی گئی ہے لوٹ آئے گی ۔

زرینہ : کھوئی ہوئی زندگی لوٹ آتی ہے کیا ؟

راحیل : ہاں لوٹ آتی ہے ۔

(اندھا اب ان کے قریب ہے)

اندھا : نہیں آتی ۔ پاگل ہو چکے ہو ۔

راحیل : زرینہ آؤ اپنا کھیت صاف کریں ۔ نئی فصل اگانے کے لیے ۔

زرینہ : اچھا !

(راحیل اور زرینہ پودوں کے پاس بیٹھ کر ہاتھوں کو اس طرح حرکت دیتے ہیں جیسے زمین پر بکھرے ہوئے خس و خاشاک کو اٹھا اٹھا کر اپنی جھولیوں میں ڈال رہے ہیں ۔
یہ اب کئی لمحے اپنے کام میں مصروف رہیں گے ۔
اندھا آگے روانہ ہو گیا ہے ۔
سٹیج پر ایک گیند آتی ہے اور اچھل کر روشنی والے کے پاس جا کر رک جاتی ہے ۔
کوہستانی گوشے سے ایک لڑکا بھاگا آتا ہے ۔
عمر نو دس برس ۔ چہرے پر ایک شریر سی مسکراہٹ ۔
لباس ایک لمبا کرتہ ۔ وہ گیند کی طرف آتا ہے ۔)

لڑکا : بھاگ ! اور بھاگ ـــ جائے گی کہاں؟

(لڑکا گیند پکڑ لیتا ہے ۔ اور اسے مارتا ہے)

پھر بھاگے گی کبھی ۔ بول اے بول نا!

(لڑکے کی نظر روشنی والے پر پڑتی ہے ۔ قریب ہو جاتا ہے)

روشنی! روشنی!! واہ واہ ۔ روشنی ۔

(روشنی والا چبوترے پر ہی ایک قدم آگے بڑھ آتا ہے ۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آجاتی ہے)

اے بابا! میں نے کہا بابا!

(لڑکا لالٹین کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے ۔ مگر اس کے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے ۔ اچھلتا ہے ، اس کا دایاں ہاتھ لالٹین کو چھو لیتا ہے ۔
اندھا اپنے سفر میں واپس آ رہا ہے ۔ روشنی والے کے پاس آ جاتا ہے ۔ لڑکا اس طرف دیکھتا ہے)

چاچا جان !

اندھا : کسے بلا رہے ہو؟

لڑکا : چاچا تمھیں ـــ تمھیں ـــ تمھیں !

اندھا : بدتمیز !

لڑکا : اے جناب! حضور! اور کیا کہوں ۔

(لڑکا اسے غور سے دیکھتا ہے)

ارے تم تو وہ ہو ـ اندھے ہو نا! ـــ ہیں ۔

(لڑکا شرارت آمیز قہقہہ لگاتا ہے)

اندھا : (غصے سے) لڑکے؟

لڑکا : (اندھے کے پاس جا کر منت سے) چاچا! مجھے گود میں اٹھا لو ذرا ـــ ہائے یہ روشنی کتنی پیاری ہے ـــ اٹھا لو نا چاچا!

اندھا : کون ہو تم!

لڑکا : (پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں آدھر رہتا ہوں ۔

اندھا : کرتے کیا ہو!

لڑکا : بھیڑیں چراتا ہوں ۔ روز چراتا ہوں ۔ آج میرے مالک کی بڑی لڑکی کی شادی ہے اس لیے مجھے چھٹی ہے ـــ روشنی کتنی خوبصورت اور پیاری ہے چاچا! اٹھا لو نا بڑے اچھے ہو ۔

(لڑکا اندھے سے لپٹ جاتا ہے)

اندھا : (لڑکے کو ہٹاتے ہوئے) چل ہٹ ۔ احمق! دفع ہو جا روشنی ـــ روشنی کیا لگا رکھی ہے؟

(لڑکا گر پڑتا ہے ۔ اٹھتا ہے)

لڑکا : بڑا آیا بادشاہ بن کو ۔ تیرے پاس تو ایک بھیڑ بھی نہیں ہے ۔

(اندھا اس کا کوئی جواب نہیں دیتا ۔ آگے چلنے لگتا ہے ۔ لڑکا ادھر آدھر دیکھتا ہے ۔ یکایک اس کی نظر ایک بڑے

پتھر پر پڑتی ہے جو دور ایک گوشے میں پڑا ہے۔ بھاگ کر ادھر جاتا ہے۔ پتھر کو دھکیلتے ہوئے ادھر لانے لگتا ہے۔ ساتھ ساتھ کہتا بھی جاتا ہے ''چل میرے پتھر چل چل چل ـــ چل میرے پتھر۔ چل چل چل'' پتھر عین لالٹین کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ اس پر کھڑا ہو جاتا ہے اور شیشے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ خوشی کی ایک چیخ اس کے ہونٹوں سے نکل جاتی ہے۔ لالٹین والا مسکراتا ہے)

کچھ روشنی مجھے بھی دے دو؟ ـــ

(لڑکا دونوں ہاتھ لالٹین پر رکھ دیتا ہے)

اوہ یاد آیا۔ ہمارے گھر میں ایک چھوٹی سی لالٹین ہے۔ لے آؤں۔ دو گے نا روشنی (مایوسی سے) پر وہ لالٹین تو ٹوٹی ہوئی ہے۔

(لڑکا کچھ سوچنے لگتا ہے۔ پھر پتھر سے نیچے آتا ہے ـــ کوہستانی گوشے کی طرف بھاگنے لگتا ہے اور نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ اندھا بدستور اپنے سفر میں مصروف رہتا ہے۔ راحیل اور زرینہ دونوں جھولیاں بھر کر، اٹھ بیٹھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہیں جیسے انہوں نے جھولیوں میں بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر اپنی دونوں جھولیاں خالی کر دیتے ہیں۔ دونوں اپنے ''گھر'' کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ کوہستانی گوشے سے دو شخص آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دراز قامت ہے۔ دوسرا پست قامت کافی فربہ ہے۔ دونوں بڑھیا سوٹوں میں ملبوس ہیں۔ دراز قامت کی آنکھوں پر سنہری فریم والی عینک ہے۔ پست قامت کے ہاتھ میں چھڑی ہے۔ وہ روشنی والے کے پاس آ کر رک جاتے ہیں۔ روشنی

والے پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ھیں اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ھیں)

دراز قامت : روشنی آ گئی ۔

پست قامت : رونق آ گئی ۔

دراز قامت : تو اب پروگرام کیا ھے؟

پست قامت : آج سے ایک مدت پہلے ھم نے ایک بڑا شاندار منصوبہ بنایا تھا ۔

دراز قامت : اب وقت آ نہیں گیا کہ اسے عملی جامہ پہنا دیا جائے؟

پست قامت : آ گیا ھے اور لازماً آ گیا ھے ۔

(دونوں سامنے دیکھنے لگتے ھیں)

دراز قامت : بہت اچھا ۔

پست قامت : کیا سوچا؟

دراز قامت : منصوبہ یہی تھا نا کہ اس مقام پر ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل ملز بنائی جائے ۔

پست قامت : بنک کیا کہتا ھے ؟

دراز قامت : کم و بیش ستر لاکھ بنک دے سکتا ھے ۔

پست قامت : ستر لاکھ ؟

دراز قامت : دوسرے ذرائع سے تیس لاکھ مل جائیں گے ۔

پست قامت : بس تو ٹھیک ہے۔

دراز قامت : .O. K-

(پست قامت اور دراز قامت دونوں روشنی دائرے سے ہٹ کر اُدھر جانے لگتے ہیں جہاں راحیل کا کھیت ہے۔ وہاں پہنچ کر ان کے قدم رک جاتے ہیں۔ دراز قامت کھیت کے ارگرد اپنی چھڑی گھماتا ہے)

کیسی ہے یہ جگہ!

پست قامت : بہت موزوں۔ بہت اچھی — Excellant-

(دراز قامت اپنی چھڑی سے ایک پودا گرا دیتا ہے۔ راحیل اور زرینہ دونوں اُدھر بھاگتے ہیں)

راحیل : یہ ہمارا کھیت ہے۔

دراز قامت : کھیت ہے تو کیا ہے۔ تمہیں اس کی قیمت مل جائے گی۔

راحیل : نہیں میں نہیں بیچ سکتا۔

دراز قامت : دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ اچھے پیسے مل جائیں گے تجھے۔ یہاں ایک عظیم الشان کارخانہ بنے گا۔

زرینہ : یہ ہمارا کھیت ہے!

پست قامت : کھیت ہے تو سر پر اٹھا کر لے جاؤ — یہاں پر ملز بنے گی اور آج ہی سے کام شروع ہو رہا ہے۔

دراز قامت : آج ہی سے۔

(دراز قامت باقی دونوں پودے بھی گرا دیتا ہے۔ زرینہ چیخ مار کر گرے ہوئے پودوں پر گر پڑتی ہے)

راحیل : تم لوگ ـــ

(راحیل کو اپنے جذبات کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ دانت پیس کر رہ جاتا ہے)

پست قامت : (اپنے ساتھی سے) آؤ انتظام کریں۔

دراز قامت : ضرور!

راحیل : ہم یہاں کچھ نہیں بننے دیں گے۔ یہ ہمارا کھیت ہے۔ یہ صدیوں سے ہمارے پاس ہے۔ ہمارے نگر دادا نے اسے خریدا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے یہاں فصلیں اگائی ہیں۔

دراز قامت : وہ زمانہ بیت گیا۔

(اندھا رک کر یہ باتیں سن رہا ہے۔ زرینہ ابھی تک زمین پر پڑی ہے)

راحیل : یہ ہمارا کھیت ہے۔

پست قامت : کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ ہمارا کھیت ـــ ہمارا کھیت۔ جاؤ جو جی میں آئے کرتے پھرو ـــ بھاگو یہاں سے (دراز قامت سے) آؤ جی چلیں! بڑا کام کرنا ہے۔ مزدوروں کو بلا کر یہ ساری زمین صاف کرانی ہے آج!

راحیل : نہیں!

(زرینہ اٹھ بیٹھتی ہے)

زرینہ : نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

دراز قامت : بکنے دو انھیں ۔ کیا بگاڑ سکتے ہیں ۔

(پست قامت اور دراز قامت جانے لگتے ہیں ۔ راحیل اور زرینہ انھیں جاتے ہوئے دیکھتے ہیں)

زرینہ : اب کیا ہوگا؟

اندھا : (لاٹھی زور سے زمین پر مار کر) کچھ نہیں ہو گا!

راحیل : اندھے، بے شرم، بے حیا ۔

اندھا : (قہقہہ لگا کر) کچھ نہیں ہو گا ۔ کچھ نہیں ہو سکتا ۔

راحیل : چپ ہوتا ہے یا نہیں ؟

(راحیل غصے سے اس کی طرف جانے لگتا ہے ۔ زرینہ ''نہیں'' کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے ۔ راحیل ہاتھ چھڑانے لگتا ہے کہ اس کی نظر زرینہ کی دائیں کہنی پر پڑتی ہے ۔ جس سے لہو بہ رہا ہے ۔)

آوہ — تمہاری کہنی !

(زرینہ کرتے کے دامن سے کہنی کا لہو صاف کرتی ہے)

زرینہ : گر پڑی تھی!!

راحیل : ظالم — کمینے ۔ ڈاکو ۔

اندھا : انھی کے ہاتھ میں تمہاری تقدیریں ہیں ! ہی ۔ ہی ہی ۔ ہا ۔ ہا ۔ ہا !

(راحیل اس کی طرف شعلہ ناک نظروں سے دیکھتا ہے ۔ زرینہ احتیاطاً اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

زرینہ : آؤ گھر چلیں!

(راحیل سر جھکا کر چپ چاپ زرینہ کے پیچھے چلتا ہے۔ کوہستانی گوشے سے ایک جوڑا آتا ہے۔ مرد ادھیڑ عمر کا ہے۔ نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں چھڑی، فربہ اندام، رنگ سفید، منہ میں پائپ، جسے بات کرتے وقت وہ ہونٹوں کے ایک گوشے میں دبا لیتا ہے۔ عورت جوانی کی منزل سے گزر چکی ہے۔ مگر میک اپ نے اس کے چہرے کو خاصا دلکش بنا دیا ہے۔ شوخ رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے ہے۔ وہ خراماں اس طرف، آرہے ہیں۔ راحیل اور زرینہ ''گھر'' کی طرف جاتے ہوئے رک جاتے ہیں)

مرد : Wonderful۔

عورت : Yes, Dear۔

مرد : کائنات کتنی خوبصورت اور دلکش ہو گئی ہے۔

(دونوں روشنی والے کے پاس آگئے ہیں۔ عورت روشنی والے کو دیکھتی ہے)

عورت : چچ، چچ، چچ، چچ۔

مرد : کیا ہے ڈارلنگ۔

عورت زخمی کیوں ہے بے چارا!

مرد : ڈارلنگ۔

عورت ۔ Yes, Please۔

مرد : تم نے راستے میں کہا تھا۔ روشنی زندگی ہے اور زندگی روشنی ہے۔

عورت : (ہنس کر) تمہیں اس میں شک ہے؟

مرد : نہیں بالکل نہیں۔

عورت : (روشنی والے کے پاؤں پر نظر ڈال کر) پاؤں دیکھو۔ سوج گئے ہیں۔

مرد : (بے پروائی سے، ہاں ڈارلنگ، کیوں نہ روشنی اور زندگی کو یکجا کر دیا جائے؟

عورت : Wonderful Idea۔

مرد : ہمارا بنگلہ بڑا خوبصورت اور وسیع ہے۔ مگر ہماری بہو جو آنے والی ہے۔ وہ بنگلہ اس کے لئے چاہیئے۔

عورت : تو!

مرد : مجھے ایک بڑا خوبصورت آئڈیا سوجھا ہے۔

عورت : تمہارا ہر آئڈیا خوبصورت ہوتا ہے۔ ڈیر!

(دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ راحیل اور زرینہ انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اپنے ”گھر“ کے پاس کھڑے ہیں)

مرد : تم جیسا خوبصورت آئڈیا ہے۔

عورت : اوہ شکریہ!

مرد : وہ بنگلہ ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیں۔

عورت : اور ہم؟

مرد : نیا بنگلہ یہاں بنوائیں گے۔ روشنی کے عین سامنے!

عورت : Wonderful۔

مرد : کیوں!

عورت : ڈارلنگ! تم تو آج ایک نہایت خوبصورت شاعر

بن گئے ہو۔ اور یہ تم نے ایک بڑی پیاری نظم کہی ہے۔

مرد : وہ دیکھو!

(گھر کی طرف اشارہ کرتا ہے)

بنگلے کے لئے یہ جگہ سب سے زیادہ مناسب ہے۔

عورت : مگر وہاں تو ـــ

مرد : ڈارلنگ ان بدتمیزوں کو یہاں رہنے کا کیا حق ہے؟

عورت : مگر ـــ

مرد : سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ دے دیں گے۔ بھوکے محتاج لوگ ہیں۔

عورت : پھر تو ٹھیک ہے۔

(مرد اور عورت گھر کی طرف جانے لگتے ہیں۔ راحیل اور زرینہ ابھی تک گھر کے باہر کھڑے ہیں)

مرد : اے ـ تم لوگ کیا مانگتے ہو!

زرینہ : میرا بچہ۔

راحیل : یہ تو کچھ اور پوچھ رہے ہیں!

مرد : اچھی رقم مل جائے گی تمہیں۔

راحیل : کیوں؟

مرد : (گھر کی طرف اشارہ کر کے) یہاں ہمارا بنگلہ بنے گا!

راحیل : یہ ہمارا گھر ہے!

مرد : اسی لئے تو تمہیں روپے دیں گے۔

راحیل : ہمیں روپیہ نہیں چاہیے۔

مرد : تو کیا ہوا ہمارے اس بنگلے میں نوکروں کا ایک کوارٹر خالی ہے ۔ وہ تمہیں دے دیں گے!

(راحیل غصے سے مرد کو دیکھتا ہے ۔ انڈا چاٹتے چاٹتے رک گیا ہے ۔)

عورت : (ملائمت سے کچھ رقم نقد بھی دے دیں گے ۔

راحیل : یہ ہمارا گھر ہے!

مرد : کہا جو ہے تمہیں اس کے عوض اچھی خاصی رقم دے دیں گے ۔

راحیل : نہیں !

مرد : نہیں کا کیا مطلب ہے ؟

راحیل : یہ ہمارا گھر ہے ۔ ہم اپنا گھر کسی کو کیوں دیں؟

مرد : ضد کرو گے تو سخت نقصان اٹھاؤ گے ۔

زرینہ : آپ اپنا گھر بیچ دیں گے ؟

مرد : میں بیچنے کے لئے تیار ہوں ۔ تم خرید لو ۔ دیتے ہو پانچ لاکھ !

(مرد بیوی کو مسکرا کر دیکھتا ہے)

زرینہ : پانچ لاکھ؟ یہ کیا ہوتا ہے!

عورت : (فخر سے) اتنے روپے ہوتے ہیں کہ تم کبھی گن بھی نہ سکو ۔

راحیل : یہ ہمارا گھر ہے!

مرد : (غصے سے) کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے تم نے۔ شرافت سے رقم وصول کرو ورنہ میں زبردستی یہاں اپنا بنگلہ بنوانا شروع کردوں گا اور پھر چیختے رہ جاؤ گے۔

راحیل : نہیں۔

(مرد گھر کے اندر جاتا ہے اور پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی پرے پھینک دیتا ہے)

مرد : یوں باز نہیں آؤ گے تم!

عورت : (مرد سے) چھوڑو ڈارلنگ!

مرد : (راحیل سے) آج میرے یہاں آکر فیصلہ کر لو اور اپنی رقم لے لو۔ نہر کے سامنے میرا بنگلہ ہے، کل سے یہاں عمارت شروع ہو جائے گی۔

عورت : ٹھیک ہے ڈارلنگ چلو۔

راحیل : ہمارا گھر ـــــ

مرد : بس اب بکواس بند کرو!

عورت : چلو نا ڈارلنگ! بات ختم ہو گئی ہے!

(عورت مرد کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ دونوں جانے لگتے ہیں راحیل اور زرینہ یوں کھڑے ہیں جیسے اس حادثے نے ان کے دماغوں کو شل کردیا ہے۔ چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔ جوڑا کوہستانی گوشے کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ اندھا شرارت آمیز مسکراہٹ سے اپنا سر ہلا رہا ہے)

اندھا : کھیت چھن گیا اور اب گھر۔

(راحیل اور زرینہ اس انداز سے اندھے کی طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی وحشت ناک خواب سے بیدار ہو رہے ہیں)

راحیل : اندھے!

(اندھا ان کی طرف آنے لگتا ہے)

اندھا : کتنی مدت تک تم اندھیروں میں روشنی کے لئے چیختے رہے اب روشنی آئی تو تم سے تمہارا سب کچھ چھن گیا ، اب سڑکوں پر مارے مارے پھرو ، کوئی ٹھکانا نہیں ہے تمہارا ۔ یونہی ایک دن سسک سسک کر مر جاؤ گے ۔ قصہ ختم!

راحیل : خاموش اندھے!

اندھا : میرے خاموش ہو جانے سے کیا حقیقت بدل جائے گی ۔ تمہیں تمہارا کھیت مل جائے گا ۔ تمہارا گھر مل جائے گا ۔ پاگلو ! کچھ نہیں ملے گا ۔ ہاں ایک چیز ضرور ملے گی ۔ ایک چیز بڑی جلدی ملے گی اور وہ چیز ہے ذلت آمیز موت !

راحیل : خدا کے لئے چپ رہو ۔ ورنہ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا ۔

اندھا : ذلت انگیز موت ۔ فاقہ کشی اور—

(راحیل اس کی طرف بڑھتا ہے اور اسے دھکا دے کر پرے پھینک دیتا ہے ۔ زرینہ جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

زرینہ : کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟

(اندھا اٹھتا ہے)

اندھا : غصہ مجھ پر اتارتے ہو ۔ اچھا اتارو ! مجھے مار ڈالو میرا گلا گھونٹ دو ۔ مگر میں تمہارا دوست ہوں ۔ تمہارا خیر خواہ ہوں دشمن تو وہ ہے ۔

راحیل : وہ لوگ ۔

اندھا : وہ لوگ نہیں ، جنہوں نے تم سے کھیت اور گھر چھینا ہے ——

راحیل : تو اور کون؟

اندھا : تم نہیں سمجھتے ۔ نہیں سمجھتے (راز دارانہ انداز میں) یہ روشنی !

راحیل اور زرینہ : (ایک ساتھ) روشنی !

اندھا : روشنی ۔ اور صرف روشنی ۔ اندھیروں میں تم اپنے کھیت کے مالک تھے ۔ اپنے گھر کے مالک تھے ۔ روشنی آئی تو یہ ظالم لوگ آگئے ۔ انہوں نے چاہا کہ روشنی پر اپنا قبضہ کر لیں اور انہوں نے تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا ۔ حقیقی دشمن کون ہے تمہارا ؟ اور ابھی تم سے تمہاری آخری چیز بھی چھن جائے گی ۔

راحیل : آخری چیز !

اندھا : تمھاری زرینہ !

راحیل : (تڑپ کر) کیا !

اندھا : انسان بڑا ظالم ہے ۔ میں کہتا ہوں اپنے دشمن کو ختم کر دو !

راحیل : کیسے !

اندھا : ابھی تک نہیں سمجھے ۔ پاگل ہو نا ۔

(اندھے کی آواز اب خوفناک حد تک بلند ہو گئی ہے)

اس دشمن کو ختم کر دو جس نے تمھیں عاجز و ناکارہ بنا دیا ہے ۔ تمھارے بازوؤں میں قوت ہے ۔ تم اپنے دشمن کا خاتمہ کر سکتے ہو ۔ کر دو خاتمہ ۔ مٹا دو اپنے دشمن کو !

زرینہ : دشمن !

اندھا : ورنہ اپنی زرینہ کو آخری بار مل لو ــــ میں کسی کے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں ۔ اس کے بازو تم سے زیادہ طاقتور ہوں گے ۔ زرینہ چلی جائے گی اور تم چیخ چیخ کر گر پڑو گے ۔ اور خاک میں مل کر خاک ہو جاؤ گے ۔ یہ ہے تمھارا انجام ۔

(راحیل ٹکٹکی باندھ کر اندھے کو دیکھتا ہے ۔ پھر اس کی نظریں روشنی والے پر پڑتی ہیں۔ اندھا زور سے وحشیانہ قہقہہ مارتا ہے ۔ راحیل اندھے کی طرف جاتا ہے ۔ یکایک رک لگاتا ہے ۔ اس کی نظر اس پتھر پر پڑتی ہے جسے لڑکے نے روشنی والے کے پاس رکھا تھا ۔ راحیل تیزی سے آگے بڑھ

کر پتھر اٹھا لیتا ھے۔ روشنی والا جلدی سے لالٹین سینے سے ہٹا کر پہلو کی طرف لے جاتا ھے۔ راحیل پتھر مارتا ھے۔ پتھر اس کے سینے پر پڑتا ھے اور وہ دھم سے گر پڑتا ھے۔ لالٹین محفوظ ھے اور بدستور روشنی دے رھی ھے)

زرینہ : (چیخ کر) ھائے یہ تم نے کیا کیا!

اندھا : شاباش! شا۔ با۔ ش! اپنے دشمن کو مار ڈالا۔

(کوھستانی گوشے سے بوڑھا کتاب اور قلم دان اٹھائے آتا ھے۔ راحیل اور زرینہ اسے دیکھنے لگتے ھیں۔ بوڑھا آتا ھے۔ روشنی والے کو زمین پر بے حس و حرکت دیکھتا ھے۔)

بوڑھا : یہی ھونا تھا۔

آج تم پھر مر گئے۔ تمہارا لمبا سفر ختم ھو گیا۔ مگر تمہاری روشنی کا سفر ختم نہیں ھوا۔

(لالٹین کو جھک کر دیکھتا ھے)

اب کیا ھو گا۔ کون جانے!

(بوڑھا واپس جانے لگتا ھے۔ کوھستانی گوشے سے لڑکا بھاگتا ھوا آ رھا ھے۔ اس کے ھاتھ میں ایک ٹوٹی ھوئی لالٹین ھے ادھر آتا ھے اور یہ منظر دیکھ کر حیران رہ جاتا ھے۔)

لڑکا : ھیں یہ کیا! اسے کیا ھو گیا۔

(لڑکا اپنی ٹوٹی ھوئی لالٹین پرے پھینک دیتا ھے روشنی والی لالٹین اٹھا لیتا ھے!

راحیل : چھوڑ دو!

لڑکا : کیوں چھوڑوں ۔ یہ روشنی ہے ۔

(لڑکا لالٹین کو دیکھتا ہے ۔ یک بیک اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی پھیل جاتی ہے ۔ وہ لالٹین کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہے ۔ اور پتھر کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اب اس کی حالت پہلی حالت سے یکسر مختلف ہو جائے گی وہ انتہائی سنجیدہ اور متین نظر آنے گا ۔ پہلے روشنی والے کی طرح زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہے گا ۔)

راحیل : (غصے سے) چھوڑتے ہو کہ نہیں !

(لڑکا خاموش ہوتا ہے)

چھوڑ دو ۔ (گرج کر) چھوڑو !

(اندھا اس طرف آ رہا ہے)

اندھا : اب کیا ہے ؟

(راحیل اس سے لالٹین چھیننے لگتا ہے ۔ زرینہ آگے بڑھتی ہے ۔ یکایک اس کی نظر لڑکے کے دائیں رخسار پر پڑتی ہے ۔ جہاں ایک بڑا سا داغ دکھائی دے رہا ہے)

زرینہ : تم—تم ! راحیل ! میرا بیٹا !—میرا بیٹا—میرا بیٹا ۔

(راحیل اپنے ہاتھ کھینچ لیتا ہے)

میرا بیٹا : میرا نومیل—یہ دیکھو اس کے گال پر نشان میری گود سے ایک بار گر پڑا تھا نا ۔ وہی نشان ہے ۔ میرا نومیل ۔ میرا لال ۔

راحیل : نومیل !

زرینہ : ہمارا بیٹا مل گیا!

(زرینہ اس سے لپٹنا چاہتی ہے مگر لڑکا کوئی حرکت نہیں کرتا ۔ بڑی بے نیازی سے کھڑا رہتا ہے)

راحیل : نومیل ۔

اندھا : انسان پاگل ہے ۔ تم لوگ پاگل ہو گئے ہو ۔

زرینہ : بیٹے — میرے بیٹے! — تجھے کیا ہو گیا ہے میں تیری ماں ہوں — یہ ترا باپ ہے ۔

راحیل : بیٹے! — بیٹے! نومیل بیٹے!!!

زرینہ : ہائے میرے اللہ! یہ تو بولتا ہی نہیں — اسے کیا ہو گیا ہے — راحیل اسے بلاؤ ۔

راحیل : نومیل! — نومیل ۔

(زرینہ اور راحیل ایک بڑی کشمکش کے عالم میں لڑکے کو دیکھ رہے ہیں ۔ لڑکا ان سے بے نیاز کھڑا ہے ۔ اور لالٹین کی روشنی سٹیج پر ایک دائرہ نور پھیلا چکی ہے ۔ اسی حالت میں پردہ آہستہ آہستہ گرنے لگتا ہے)

شہید

کردار :۔

- ○ رضیہ
- ○ ماں
- ○ باپ
- ○ شاداں

اور

ایک سایہ

منظر

زمانہ : ٦ ستمبر ١٩٦٦ع
مقام : شہر قصور کی ایک نواحی بستی
جائے وقوع : ایک دو منزلہ مکان کا نچلا کمرہ
وقت : شام

سٹیج جس کمرے کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہمیں پہلا تاثر یہ دیتا ہے کہ ستمبر ١٩٦٥ع کی بھارتی بمباری سے یہ مکان ، جس کا یہ کمرہ ایک حصہ ہے ، کافی حد تک متاثر ہو چکا ہے اور اب گھر والے اس کی آرائش و تہذیب کی طرف توجہ نہیں دیتے ۔

کمرے کا سامان کسی ترتیب سے نہیں رکھا گیا ۔ دیواروں میں کچھ دراڑیں دکھائی دے رہی ہیں ۔ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ جس کا ایک پٹ کھلا ہے ۔ اس پٹ میں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں ۔

دوسرا دروازہ دائیں دیوار میں جس کے آگے صحن ہے ۔ باہر اندر آنے کے لیے یہی دروازہ استعمال ہوتا ہے ۔

کمرے کے درمیانی حصے میں ایک میز ، اس پر پھولوں سے یکسر محروم دو گلدان ۔ چائے کی ٹرے ، چند خالی پیالیاں ، ایک پلیٹ ۔ پلیٹ پر روٹی کے کچھ ٹکڑے ۔ ان کے علاوہ جاوید کی کم و بیش ایک فٹ اونچی

اور ایک فٹ سے کچھ کم چوڑی تصویر ۔ تصویر کے رنگین فریم کے اوپر ایک سنہری ہار ۔ یہ ہار فریم کے اوپر سے ہوتا ہوا میز پر پھیلا ہوا ہے ۔

ادھر ادھر چار کرسیاں ، ایک صوفہ سیٹ ۔ صوفوں پر میلے کپڑے ، کتابیں اور اخبارات ، کمرے کے بلب روشن ہیں ۔

پردہ اٹھنے پر ہم رضیہ کو دیکھتے ہیں جو میز کے پاس ایک کرسی پر اس انداز سے بیٹھی ہے کہ اس کا سر میز کے سرے پر جھکا ہوا ہے اور ہاتھوں نے سر اور چہرے کو اپنے حلقے میں لے رکھا ہے ۔ اس کا جسم مسلسل کانپ رہا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے سسکیاں بھر رہی ہے ۔

صحن والے کمرے سے ماں آتی ہے ، عمر چالیس کے لگ بھگ ، چہرہ اداس اور ستا ہوا ۔ لباس شلوار ، قمیص اور دوپٹہ ۔

وہ بیٹی پر نظریں جمائے آگے بڑھتی ہے ۔ اس کے پاس آتی ہے اور جھک کر آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے ۔

رضیہ کی کپکپاہٹ بڑھ جاتی ہے

ماں : رجو ـــــ نہ بیٹی ! نہ ۔

(ماں یہ فقرہ کہتے ہوئے نفی میں اپنا سر ہلاتی ہے اور رضیہ کو اٹھانے کی کوشش کرتی ہے)

رضیہ : (سر اٹھائے بغیر) امـــمیـــمی !

ماں : اٹھو ـــ رجو ! اٹھو نا بی بی رانی !

(ماں اس کے دائیں بازو پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

شاباش ! اٹھ بیٹھو !

(رضیہ اٹھنے لگتی ہے ۔ سسکیاں ابھی تک بھر رہی ہے ۔

رخسار آنسوؤں سے تر معلوم ہوتے ہیں، آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔

وہ اٹھ کر، نگاہیں جھکائے کھڑی ہے۔ ماں شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔

رضیہ کی عمر دس برس سے زیادہ نہیں ہے۔ لباس وہی جو ماں کا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر ماں کو دیکھتی اور پھر بے اختیاری کے عالم میں دائیں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے اور ایک قدم اور ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔ ماں اسے خود سے لپٹا لیتی ہے اور کہتی ہے ''چپ بیٹی! چپ'')

رضیہ : (ماں سے الگ ہوتے ہوئے) امی!

ماں : جاؤ جاؤ منہ ہاتھ دھو لو!

(رضیہ صحن والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ ماں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ جب وہ دروازے میں سے گزر جاتی ہے تو تصویر کو دیکھتی ہے۔ ایک آہ بھرتی ہے اور ٹرے میں پلیٹ اور خالی پیالیاں رکھنے لگتی ہے۔

صحن والے دروازے سے باپ آتا ہے۔

ادھیڑ عمر کا آدمی، کمر کسی قدر جھکی ہوئی۔ چھدری داڑھی، آنکھوں پر عینک۔ ہاتھ میں چھڑی۔ پاجامے، کرتے اور واسکٹ میں ملبوس۔ دائیں شانے پر ایک پیلے رنگ کا پٹکا۔ چہرہ افسردہ مگر معلوم ہوتا ہے اپنی افسردگی پر قابو پانے کا ڈھنگ جانتا ہے۔

ماں اپنے کام میں مصروف ہے)

باپ : فاطمہ!

(ماں ٹرے وہیں میز پر رکھ دیتی ہے اور شوہر کو دیکھتی ہے)

ماں : آپ کہاں چلے گئے تھے!

باپ : یہیں تھا ، رجو کہاں گئی !

ماں : میں آئی تو میز پر سر رکھ کر رو رہی تھی !

باپ : بچی ہے نا ۔ صبر آتے آتے آئے گا !

ماں : اور آج کے دن تو زخم ہرے ہوگئے ہیں ہم سب کے !

باپ : آج کے دن ـــ (فقرہ مکمل نہیں) اور اب کہاں ہے !

ماں : میں نے کہا تھا : منہ دھو لے ـــ غسل خانے میں گئی ہے !

باپ : صبر کی تلقین کرو ۔

ماں : صبر کی تلقین ! ـــ کس طرح کروں ؟

باپ : یہ ہار کس نے ڈالا ہے !

(باپ آگے بڑھ کر چھڑی میز پر رکھ دیتا ہے ۔ اور تصویر پر نظر ڈالتا ہے)

ماں : رجو نے ـــ بھائی کے گلے میں تو ڈال نہ سکی اس کی تصویر ـــ

(ماں فقرہ مکمل نہیں کر پاتی ۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگتی ہے)

باپ : اللہ کو یہی منظور تھا فاطمہ !

ماں : اچھا اللہ کی مرضی ۔

باپ : یہ سعادت دنیا میں بڑے خوش قسمت ہی کے حصے میں آتی ہے ، شہادت کو تم کیا سمجھتی ہو ؟ ـــ وطن کی خاطر جان دینا ـــ یہ شرف بڑے

خوش قسمت ہی کو ملتا ہے ۔

ماں : اچھا اللہ ہمیں صبر دے ! میں نے کہا رجو کے ابا !

(ماں سر اُٹھا کر شوہر کو دیکھتی ہے)

باپ : کہو !

ماں : تصویر اُٹھا کر کہیں اور نہ رکھ دوں!

(ماں شوہر کے جواب کا انتظار کیے بغیر تصویر اُٹھانے لگتی ہے ، دروازے پر رضیہ آتی ہے)

رضیہ : امی!

(فاطمہ شوہر کو دیکھتی ہے جیسے پوچھ رہی ہے کہ تصویر لے جاؤں یا یہیں رہنے دوں)

باپ : رہنے دو!

(ماں تصویر وہیں رکھ دیتی ہے — رضیہ آتی ہے اور ہار کی ترتیب درست کرنے لگتی ہے ۔ ماں اور باپ — دونوں کی نظریں اس پر جمی ہیں)

باپ : رجو بیٹی!

رضیہ : جی ابا جان!

(رضیہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہار کا جائزہ لینے لگتی ہے)

باپ : تم نے پرسوں ترسوں کہا تھا مجھ سے کہ واپسی پر تمہارے لئے ٹافیاں لیتا آؤں ۔ مجھے یاد ہی نہیں رہی یہ بات ! چلو اب لے آئیں ، جو ٹافیاں اچھی لگیں ، لے لینا ۔

(رضیہ نفی میں سر ہلاتی ہے)

ماں : کیوں رجو!

باپ : تم نے خود ہی تو ٹافیوں کے لئے کہا تھا ۔

ماں : جاؤ بیٹی ۔

رضیہ : نہ امی!

ماں : مگر کیوں!

رضیہ : جی نہیں چاہتا ۔

باپ : چلو تو سہی ، بڑی دکان پر چلیں گے ، وہاں بہت سی نئی چیزیں آئی ہوئی ہیں ۔

(باپ دروازے کی طرف جانے لگتا ہے ۔ رضیہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے)

ماں : جاؤ نا رجو! تمہارے ابا جی کہہ رہے ہیں ۔ کیا اُن کا کہا نہیں مانو گی؟

(رضیہ دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگتی ہے ۔ دونوں دروازے میں سے نکل جاتے ہیں ۔ ماں تصویر کو دیکھتی ہے اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا ہے ۔ ''میرے اللہ''!)

وہ میز کے پاس کھڑی ہے کہ صحن والے دروازے سے آواز آتی ہے ۔ ''رضیہ''! ـــــ ماں مڑ کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے آؤ ''شادان بہن''!

دو تین لمحوں کے بعد شادان آتی ہے ۔

ماں کی ہم عمر ۔ لباس وہی ۔

شادان آگے بڑھتی ہے ، اُس کا چہرہ مسکرا رہا ہے مگر جیسے ہی نظر تصویر پر پڑتی ہے ، آداس سی ہو جاتی ہے)

شاداں: کیا بات ہے آج دن بھر اوپر نہیں آئیں۔ میں تو سمجھتی تھی تم لوگ گھر پر ہو ہی نہیں، اتنی خاموشی!

ماں: ہم تو کہیں بھی نہیں گئے۔ یہیں رہے دن بھر!

شاداں: کوئی آواز نہیں آئی۔ نہ تمہاری نہ رضیہ کی!

ماں: کیا بتاؤں بہن!

شاداں: خیر تو ہے۔ کوئی خاص بات؟

ماں: آج جاوید کی چوبیسویں سالگرہ ہوتی!

شاداں: ۶ ستمبر کو!

ماں: یہی اس کے پیدا ہونے کا دن ہے اور یہی دن ــــ

(ماں شدت تاثر سے خاموش ہو جاتی ہے)

شاداں: دکھ تو ہوتا ہی ہے ماں باپ کو ــــ

(شاداں جھک کر تصویر دیکھتی ہے)

شاداں: کتنا خوبصورت نوجوان ہے:

ماں: تصویر تو اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ تمہارا کنبہ پچھلے سال یہاں نہیں تھا۔ ورنہ تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں! اب تو ــــ

شاداں: تصویر ہی کو دیکھا جا سکتا ہے!

ماں: یہی دن تھا۔ صبح سے گھر میں بڑی رونق تھی۔ میری رجو نے یہاں رنگا رنگ کی جھنڈیاں لگا رکھی تھیں۔ سب عزیز، ہمسائے، دوست جمع کر رکھے تھے۔

اتنی چہل پہل ، اتنا ہنگامہ تھا کہ لگتا تھا کسی کی شادی ہو رہی ہے ۔ رجو کو بھائی کی سالگرہ منانے کا بڑا شوق تھا ۔ کئی ماہ سے وہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی ۔ دوست احباب میرے جاوید کو تحفے دے رہے تھے ۔ رجو نے ایک ایک پیسہ جمع کر کے جو سنہری ہار خریدا تھا وہ الماری میں سے نکال کر خوشی خوشی بھائی کی طرف لے جا رہی تھی کہ عین اس وقت ــــ

(ماں ایک لمحے کے لیے رک جاتی ہے)

شاداں : کیا ہوا ؟

ماں : دروازے پر دستک ہوئی ، جاوید کو فوج میں شامل ہونے کا حکم مل گیا تھا ۔ حکم ملتے ہی وہ جانے لگا ۔ ہم نے روکا تو کہنے لگا ۔ وطن نے پکارا ہے ، میں نہیں رک سکتا ۔

شاداں : اسی وقت چلا گیا ؟

ماں : اسی گھڑی ــ اسی لمحے ! بہن کہتی رہی ۔ بھائی جان! یہ ہار تو گلے میں ڈال لو ۔ مگر نہ مانا ! بولا ۔ واپس آ کر یہ ہار گلے میں ڈالوں گا ــ اور چلا گیا ، رجو ہار ہاتھ میں لے کر گلی میں نکل گئی ـــ لیکن ۔

شاداں : اور وہ واپس نہ آیا !

(ماں اس کے جواب میں منہ سے کچھ نہیں کہتی ۔ صرف اک آہ بھرتی ہے)

شادان : میں بھی سوچتی تھی آج بات کیا ہے — رضیہ ہے کہاں ؟

ماں : تمہارے آنے سے دو تین منٹ پہلے اپنے باپ کے ساتھ باہر گئی ہے ۔

شادان : کہاں !

ماں : باپ مجبور کر کے لے گیا ہے کہ آؤ تمہیں ٹافیاں لے دوں ۔

شادان : میرے یہاں نہیں بھیج دیا اُسے ۔ عذرا دل بہلا لیتی اُس کا !

ماں : میں نے تو کہا تھا ۔ گھر سے باہر نکلی ہی نہیں — سارا دن چپ چاپ بیٹھی رہی ہے ۔

شادان : اب آئے گی تو اپنے ساتھ لے جاؤں گی ۔

ماں : بڑی اُداس ہے ۔

شادان : اُداس تو ہونا ہی ہے ۔
(جاتے ہوئے) اب بھیج دینا ۔

ماں : اچھا !

(شادان صحن والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے ۔ اور چلی جاتی ہے ۔ شادان چلی گئی ہے ۔ مگر ماں ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی ہے — میز پر سے ٹرے اٹھاتی ہے ۔ اُس کے اوپر باقی خالی پیالیاں رکھنے لگتی ہے ۔ رضیہ آتی

ہے ۔ ہاتھوں میں ایک لفافہ ہے ۔ لفافہ وہ لا کر میز پر رکھ دیتی ہے)

ماں : تمھارے ابا جان کہاں ہیں ؟

رضیہ : وہ اپنے کسی دوست سے باتیں کرنے لگے ہیں گلی میں !

ماں : رجو !

رضیہ : جی !

ماں : عذرا نے تمھیں بلایا ہے ۔

رضیہ : کل جاؤں گی ۔

ماں : نہ بیٹی ! اس نے بلایا ہے ۔ اس کی ماں کہہ کر گئی ہے کہ رضیہ کو ہمارے ہاں بھیج دینا ۔

رضیہ : چلی جاؤں گی ۔

ماں : جلدی جاؤ ۔ میں برتن صاف کر دوں ، صبح سے پڑے ہیں ۔

(ماں پلیٹ اور پیالیاں لے کر سیڑھیوں والے دروازے کی طرف جاتی ہے ۔ ایک منٹ کے بعد وہ سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔

رطیہ وہیں کھڑی رہتی ہے ۔ آگے بڑھ کر تصویر کے قریب ہو جاتی ہے روشنی مدھم ہونے لگتی ہے ۔

یہ روشنی اتنی مدھم ہو چکی ہے کہ سٹیج پر اب جو بھی موجود ہوگا وہ واضح طور پر نظر نہیں آئے گا ۔ صرف سایہ سا دکھائی دے گا ۔ صحن والے دروازے کی طرف سے ایک سایہ بڑھتا ہے ۔ یکایک رضیہ کی آواز ابھرتی ہے ،

رضیہ : بھائی جان !

جاوید : رضیہ !

رضیہ : آپ ــــ اوہ ــــ بھائی جان ! کہاں تھے آپ !

جاوید : یہاں وہاں ، جہاں تہاں ! ہر جگہ ، ہر مقام پر! کہاں نہیں تھا میں ؟

رضیہ : آپ تو میدان سے لوٹے ہی نہیں تھے۔ ابا جان کہتے تھے کہ انہوں نے آپ کا لہو سے بھرا ہوا جسم دیکھا تھا ـــ اور بھائی جان ! آپ ـــ بھائی جان ہیں نا؟

جاوید : تم دیکھ نہیں رہیں مجھے !

رضیہ : ہائے ــــ ہمیں آپ کا کتنا انتظار تھا ۔

جاوید : مجھے معلوم تھا میری بہن میرا انتظار کر رہی ہے ۔

رضیہ : معلوم ہے آج کونسا دن ہے ۔

جاوید : ٦ ستمبر ۔ میری سالگرہ کا دن !

رضیہ : پچھلے سال اسی دن میں نے گھر کتنا سجایا تھا ۔ کتنی رونق تھی ہمارے یہاں ۔ کتنے لوگ آئے تھے اور آپ کو معلوم ہے ۔

جاوید : مجھے سب کچھ معلوم ہے !

رضیہ : میں کتنا خوبصورت ہار آپ کے لئے لائی تھی بڑے بازار سے خرید کر !

جاوید : وہ ہار میں اب بھی دیکھ رہا ہوں!

رضیہ : دیکھ رہے ہیں نا ـــ اپنی تصویر کے ارد گرد۔

جاوید : ہاں!

رضیہ : میری کتنی آرزو تھی کہ یہ ہار آپ کے گلے میں ڈالوں ـــ مگر آپ چلے گئے!

جاوید : اسی لئے تو گیا ہوں۔

رضیہ : کس لئے؟

جاوید : وہ ہار تم اب بھی میرے گلے میں ڈال سکتی ہو!

رضیہ: اچھا!

جاوید : کیوں نہیں؟

رضیہ : تو ـــ اتار دوں ہار!

جاوید : کیوں نہیں۔

(ہار فضا میں لہراتا ہے)

رضیہ : اوہ بھائی جان!

جاوید : اب تو خوش ہو نا!

رضیہ : (ہنستے ہوئے)! پسند ہے نا یہ ہار آپ کو!

جاوید : اپنی رضیہ کا ہار مجھے پسند نہیں ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ یہ ہار تو شفق اور قوس قزح کو گوندھ کر بنایا گیا ہے ـــ کتنا پیارا ـــ کتنا خوب صورت ہار ہے!

رضیہ : میں نے بیسیوں ہاروں میں اسے پسند کیا تھا!

جاوید : تم جو ہار بھی لے آتیں مجھے بے حد پسند آتا !

رضیہ : بھائی جان !

جاوید : ہاں رضیہ !

رضیہ : آپ دروازے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں ۔

جاوید : مجھے جانا ہے ۔

رضیہ : نہیں بھائی جان !

جاوید : دیکھو میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ۔ اب مجھے جانا چاہئے ۔

رضیہ : آپ کیوں جائیں گے !

جاوید : کیوں کہ مجھے جانا ہے ـــ اور جانا کہاں ہے ؟ پہلے کی طرح یہیں رہوں گا تمہارے آس پاس ، صبح کی روشنی میں ـــ دوپہر کی دھوپ میں ـــ رات کے اندھیروں میں ۔ ہر وقت تمہارے قریب ۔ تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں مگر میں تمہیں دیکھا کرتا ہوں ۔ صبح سویرے جاگتے ہوئے ۔ سکول جاتے ہوئے ، گھر لوٹتے ہوئے ، ابا جان ، امی سے باتیں کرتے ہوئے ، سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ۔ سنا رضیہ !

رضیہ : بھائی جان : نہ جائیں آپ ـــ نہ جائیں ۔

(سایہ پیچھے ہٹنے لگتا ہے ـــ دوسرا سایہ اس کی طرف بڑھتا ہے ۔ 'بھائی جان' کہتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی سٹیج پر روشنی آ جاتی ہے ۔

روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ رضیہ دروازے سے کچھ

دور کھڑی ہے ۔ باپ دروازے میں سے بڑھ رہا ہے)

باپ : کیا ہوا رجو !

رضیہ : بھائی جان !

باپ : بھائی جان ؟

رضیہ : وہ آئے تھے ۔

(ماں آتی ہے)

ماں : کون آئے تھے ؟

رضیہ : بھائی جان ـــ ابھی یہیں تھے ۔ میں نے اُن کے گلے میں ہار ڈالا تھا ۔

ماں : اچھا ؟

(ماں اور باپ ـــ دونوں کی نظریں ہار پر جاتی ہیں جو تصویر کے گرد بدستور دکھائی دے رہا ہے)

باپ : بیٹی ! جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں !

رضیہ : کہتے تھے تم میرے گلے میں ہار ڈالنا چاہتی تھیں اس لئے آ گیا ہوں ۔ اب میرے گلے میں ہار ڈال دو اور میں نے ہار اُن کے گلے میں ڈال دیا ۔

ماں : بھائی کے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی نا !

(شاداں آتی ہے)

شاداں : (ماں سے) رضیہ کو تم نے بھیجا کیوں نہیں ۔ عذرا انتظار کر رہی ہے (حیران ہو کر) کیا ہوا ـــ معاملہ کیا ہے !

ماں : کہتی ہے بھائی جان آئے تھے اور میں نے اُن کے گلے میں ہار ڈالا تھا ۔

شاداں : خواب دیکھا ہوگا !

رضیہ : نہیں چاچی ! میں نے اپنے ہاتھوں سے اُن کے گلے میں ہار ڈالا تھا ۔

شاداں : ہار تو وہ پڑا ہے بیٹی !

(شاداں آگے بڑھ کر ہار اُٹھانے کی کوشش کرتی ہے کہ یکایک چیخ کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیتی ہے)

ماں اور باپ : (ایک ساتھ) کیا ہوا ؟

شاداں : لہو !

ماں : لہو ؟

شاداں : ہار پر لہو !

(ماں جلدی سے ہار اُٹھا لیتی ہے)

ماں : سچ ۔۔۔ لہو ۔

(ماں باپ اور شاداں حیرت سے ہار کو دیکھ رہے ہیں ۔ رضیہ کی نگاہیں دروازے پر جمی ہیں اور اسی حالت میں جلدی سے پردہ گرتا ہے)

—:o:—

منظر :

سردیوں کی ایک دوپہر ۔

ایک ایسا کمرہ جو بیک وقت دیوان خانہ بھی ہے اور ڈرائنگ روم بھی ۔

ایک دروازہ سامنے کی دیوار میں جو صحن کی طرف کھلتا ہے ۔ مکان کے دوسرے کمرے اس صحن سے ملحق ہیں ۔

دوسرا دائیں دیوار میں جو باہر آنے جانے کے لئے ہے ۔

صحن والے دروازے کا ایک پٹ کھلا ہے ۔ اس میں سے دھوپ اندر آ رہی ہے ۔ دوسرے دروازے پر پردہ پڑا ہوا ہے ۔

سامنے دیوار کے پاس چارپائی کے اوپر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر زرینہ نیم دراز نظر آتی ہے ۔ تیرہ چودہ برس کی ایک بیمار لڑکی — زرد رو ، کمزور نحیف ، آنکھوں پر عینک ، ہاتھ میں کوئی کتاب جس کی وہ بے دلی سے ورق گردانی کر رہی ہے ۔

چارپائی کے پاس ایک تپائی جس پر دوائی کی شیشیاں ، ایک پلیٹ ، پلیٹ میں چند بسکٹ اور چائے کی ایک خالی پیالی ۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے زرینہ جلدی جلدی کتاب کے ورق

اُلٹ رہی ہے ۔ اُس کی ماں جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی اور عام پنجابی لباس میں ملبوس ہے ۔ ایک دھلی ہوئی صاف ستھری چادر لئے چار پائی کے پاس کھڑی ہے ۔ وہ اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ زرینہ چارپائی سے اُٹھے تو وہ چادر بدل دے ۔ چارپائی سے کچھ دور زرینہ کا باپ (عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان) اچکن کے بٹن بند کر رہا ہے)

ماں : زرینہ اُٹھو نا بیٹی !

زرینہ : کیوں اُٹھوں ۔

ماں : چادر بدل دوں ، دیکھو تو کتنی میلی ہو گئی ہے ۔

زرینہ : کہاں میلی ہے ؟

ماں : ہائے کیا کہتی ہے ۔ چادر میلی نہیں ہے ۔ صبح تیرے سامنے ہی تو رضیہ کی امی نے کہا تھا ۔ بہن ! مریض کا بستر صاف ستھرا ہونا چاہیئے ، کہا تھا یا نہیں !

زرینہ : پھر بدل دینا ۔

ماں : پھر کب ؟

باپ : زرینہ ! ماں کا کہا مان لے ۔۔ تو تو بڑی ہی اچھی بیٹی ہے ۔

(زرینہ باپ کے لفظ سن کر ایک لمحے کے لئے توقف کرتی ہے ۔ پھر بستر سے اُٹھتی ہے)

ماں : کرسی پر بیٹھ جا ـــ پل بھر کی تو بات ہے ۔

(ماں گاؤ تکیہ اُٹھا کر ایک کرسی پر رکھ دیتی ہے میلی چادر نکالتی ہے ۔ نئی چادر بچھا دیتی ہے

باپ : کرسی پر کیوں بیٹھے ۔ باہر چلی جائے دھوپ میں ۔

باپ بٹن بند کر کے تپائی کی طرف آتا ہے ۔ وہاں سے ایک کاغذ اُٹھاتا ہے)

ماں : پتا نہیں چارپائی دھوپ میں ہے یا نہیں؟

باپ : دیکھتا ہوں ۔

(باپ صحن والے دروازے میں سے نکل جاتا ہے ۔ زرینہ چارپائی کے پاس کھڑی ہے اور بدستور کتاب کی ورق گردانی کر رہی ہے ۔ ماں چادر کی سلوٹیں درست کرتی ہے ۔ میلی چادر اُس نے اپنے شانے پر ڈال لی ہے ۔
باپ اندر آتا ہے)

ماں : دھوپ میں رکھ دی ہے چارپائی؟

(باپ اثبات میں سر ہلاتا ہے)

ہاں بیٹی کیا چھوڑ آؤں تمہیں ؟

زرینہ : نہیں چلی جاؤں گی ۔

(زرینہ صحن والے دروازے کی طرف قدم اُٹھانے لگتی ہے ۔ ماں چادر کی سلوٹیں درست کر چکی ہے ۔ باپ کاغذ دیکھ رہا ہے)

ماں : آپ کہاں چلے؟

باپ : دوائی لینے ۔ ایسی ایسی دوائی لکھ دیتا ہے ڈاکٹر کہ سارا شہر چھان مارو ، نہیں ملتی ۔

ماں : (آہ بھر کر) ان دواؤں کا فائدہ ہی کیا ہے ۔

(زرینہ دروازے میں سے نکل کر جا چکی ہے ۔ ماں تپائی پر نظر ڈالتی ہے)

ڈھیر لگ گیا ہے دواؤں کا۔ میں نے کہا زرینہ کے ابا!

باپ: کسی نئے ڈاکٹر کے لیے کہو گی!

ماں: اور کیا! جب دواؤں سے فائدہ ہی نہیں تو خواہ مخواہ پیسے کیوں ضائع کریں؟

باپ: دو تین روز تو گزرنے دو۔ جب سے یہاں آئے ہیں تین ڈاکٹر بدل چکے ہیں۔

(باپ باہر والے دروازے کی طرف جانے لگتا ہے)

ماں: جلدی آ جانا۔

باپ: کوشش کرونگا۔

(باپ دروازے میں سے نکل جاتا ہے۔ ماں تپائی کے پاس جاتی ہے۔ بسکٹوں والی پلیٹ اٹھا لیتی ہے۔ اور صحن والے دروازے کی طرف جاتی ہے۔

اب سٹیج خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد باہر والے دروازے سے ہمسائی آتی ہے۔ ماں کی ہم عمر، چہرے پر نرمی اور ایک قسم کی محبت و شفقت۔

اندر آ کر ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ پھر آواز دیتی ہے۔ ''حمیدہ''۔ صحن سے ماں جواب دیتی ہے ''آئی بہن''

ہمسائی صحن والے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے کہ ماں آ جاتی ہے)

ماں: بسکٹ دینے گئی تھی زرینہ کو، صبح صرف چائے کی ایک پیالی پی ہے اور کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔

ہمسائی: باہر بیٹھی ہے؟

ماں : ہاں باپ نے ہی کہا تھا۔ دھوپ میں جا کر بیٹھ جا!

ہمسائی : اب کیا حال ہے؟

ماں : کیا پوچھتی ہو بہن! کوئی فرق بھی نہیں پڑا۔ خیال تھا نیا شہر ہے، آب و ہوا کچھ اثر کرے گی۔ مگر نہیں!

ہمسائی : بھائی صاحب کہاں گئے؟

ماں : دفتر سے تو چھٹی لے رکھی ہے۔ ڈاکٹر نے ایک پیٹنٹ دوا لکھ کر دی تھی کل، وہ لینے گئے ہیں۔

ہمسائی : کسی نئے ڈاکٹر کو دکھایا یا نہیں؟

ماں : ہاں! ہماری تو اس شہر میں کسی سے واقفیت ہی نہیں۔ ان کے دوست ہی ڈاکٹر کا پتا بتلاتے ہیں، لے آتے ہیں اسے گھر پر۔ پچھلے چار پانچ مہینوں میں یہ تیسرے ڈاکٹر کا علاج شروع کروایا ہے۔

ہمسائی : بیماری کیا ہے بچی کو؟

ماں : بتا تو چکی ہوں تمہیں بہن۔ معدہ کوئی چیز قبول نہیں کرتا۔

(ماں نے گاؤ تکیہ کرسی پر رکھ کر بستر کی چادر بچھائی تھی۔ مگر اسے واپس نہیں رکھا تھا۔ اب اس پر نظر پڑتی ہے تو تکیہ اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیتی ہے)

اندر کچھ جانے ہی نہ تو کیا حال ہوگا؟ روز بروز

کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ پیٹھ میں بھی درد رہتا ہے ـــ جانے کیا بیماری ہے۔

(یہ لفظ کہتے ہوئے ماں کی آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ دوپٹے کے پلو سے انہیں صاف کرتی ہے)

ہمسائی : اللہ رحم کرے گا۔

(ہمسائی ذرا آگے بڑھ کر قریب ہو جاتی ہے)

میں نے کہا بہن!

ماں : ہوں!

ہمسائی : ایک ڈاکٹر کا پتا بتاتی ہوں۔

ماں : کس ڈاکٹر کا؟

ہمسائی : ڈاکٹر احمد اکرام کا۔ جو کچھ دیکھا وہ بیان کرتی ہوں۔ میری نند کا حال اتنا خراب ہوگیا تھا کہ کیا کہوں۔ معدے میں پانی تک نہیں ٹکتا تھا۔ کئی ڈاکٹروں کا علاج کروایا۔ کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر اللہ نے اس ڈاکٹر کے ہاتھ سے شفا بخشی۔ یہ تو میری نند کا معاملہ تھا۔ میری پھوپھی ساس کا حال نند سے بھی برا تھا۔ کچھ کھاتی تو قے آ جاتی فوراً۔ سارے بدن میں درد رہتا تھا۔ اسی ڈاکٹر نے علاج کیا تو آرام آ گیا۔ اب بالکل ٹھیک ہے حالانکہ بوڑھی ہے۔

ماں : کہاں ہے بہن یہ ڈاکٹر؟

ہمسائی : بڑا قابل اور لائق ڈاکٹر ہے ۔ ایسا ڈاکٹر سارے شہر میں کیا پورے ملک میں نہیں ہوگا ۔

ماں : اللہ تمہارا بھلا کرے ۔ میری بچی کا دکھ درد دور ہو جائے تو نئی زندگی مل جائے ہمیں!

ہمسائی : اس ڈاکٹر کا نام تم نے سنا نہیں کبھی؟

ماں : کیسے سن سکتے تھے ۔ پانچ مہینے تو ہوئے یہاں آئے ہوئے!

ہمسائی : اللہ نے چاہا تو سب بیماری ویماری دور ہو جائے گی!

ماں : تمہاری زبان اللہ مبارک کرے ۔ رہتے کہاں ہیں یہ ڈاکٹر صاحب؟

ہمسائی : نئی کالونی کے آخر میں انہی کی کوٹھی ہے ، ایک تو بڑے لائق ڈاکٹر ہیں ۔ اور پھر بڑے اصول پرست بھی ہر ایک سے ایک جیسا سلوک ، امیر غریب سے ایک جیسی فیس ۔

ماں : یہ انہیں جانتے ہی نہیں ہوں گے!

ہمسائی : جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے!

ماں : تمہاری رضیہ کے ابا تو انہیں جانتے ہونگے ۔

ہمسائی : ہمارے گھر کے سب لوگ انہیں جانتے ہیں ۔

ماں : تو پھر زرینہ کے ابا سے کیوں کہوں ۔ تم خود ہی تکلیف کر کے نہیں بلوا دیتیں انہیں؟

ہمسائی : کیوں نہیں ، اگر انہوں نے کسی اور کو وقت نہیں دے رکھا تو آ جائیں گے ۔

ماں : بڑی مہربانی تمھاری ۔ کسے بھیجو گی؟

ہمسائی : بھیجنا کسے ہے ۔ ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے ۔ کار ان کی اپنی ہے ۔

ماں : تو بلا دو نا انہیں میری بہن!

ہمسائی : میرا بڑا بیٹا گھر پر ہی ہے آج ۔ ٹیلی فون کیے دیتا ہے ۔

ماں : فیس کیا ہے؟

ہمسائی : سولہ ! میں نے کہا نہ ، بڑے با اصول ڈاکٹر ہیں ۔ ہر جگہ یہی فیس مقرر ہے ۔

ماں : جاؤ جلدی کرو ۔

ہمسائی : ابھی کہتی ہوں اس سے جا کر ۔

(ہمسائی باہر والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

ماں : مجھے اطلاع دے دینا کہ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں یا نہیں ۔

ہمسائی : فون کروانے کے بعد بتا جاؤں گی ۔

ماں : اچھا ۔

(ہمسائی چلی جاتی ہے ۔ اس کے بعد ماں صحن والے دروازے کی طرف جاتی ہے ۔
سٹیج پھر خالی ہو جاتی ہے

ماں واپس آتی ہے ۔ تپائی کی چیزیں اٹھا کر سامنے کی دیوار کے ساتھ جو انگیٹھی ہے وہاں رکھنے لگتی ہے ۔ ہمسائی اندر والے دروازے سے اندر جھانکتی ہے)

ہمسائی : میں نے کہا بہن ۔

ماں : ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں کیا ؟

ہمسائی : ہاں ۔

ماں : ابھی آ رہے ہیں نا !

ہمسائی : ساتھ لے کر آؤنگی ، زرینہ کو اندر بلا لو !

ماں : بہتر !

(ہمسائی چلی جاتی ہے ۔ ماں نے تپائی خالی کر دی ہے ۔ کرسی اٹھا کر وہ چارپائی کے اور قریب لے جا کر رکھ دیتی ہے ۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد صحن والے دروازے کے قریب جاتی ہے اور پکارتی ہے ''زرینہ بیٹی'' ۔ آدھر سے جواب ملتا ہے ''اچھا'' ۔

ماں دو تین لمحے وہیں رک کر انتظار کرتی ہے ۔ جب زرینہ نہیں آتی تو دروازے میں سے نکل جاتی ہے ۔ اور زرینہ کو ساتھ لے کر آتی ہے زرینہ نے شال آتار دی ہے ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے ۔ دونوں چارپائی کی طرف جانے لگتی ہیں)

زرینہ : کون ہے امی !

ماں : رضیہ کی ماں نے تو اس کی بڑی تعریف کی ہے ۔

زرینہ : تو ابو کہاں گئے ہیں ۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے !

ماں : دوا لانے گئے ہیں ۔

زرینہ : اور دوا لے آئے تو ؟

ماں: یہ دوا بھی اس ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔

(زرینہ بستر پر بیٹھ کر گاؤ تکیہ کا سہارا لیتی ہے۔ کتاب ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے)

اب کتاب رکھ دو نا ایک طرف——دے مجھے!

(زرینہ کتاب تکیے کے اوپر رکھ دیتی ہے۔ ماں وہاں سے اٹھاتی ہے اور انگیٹھی کی طرف جاتی ہے اور وہاں رکھ دیتی ہے۔ پھر لوٹتی ہے)

زرینہ: آرہے ہیں امی!

ماں: ہاں رضیہ کی ماں، دو منٹ ہوئے یہی کہہ کر گئی ہے۔ آ ہی رہے ہوں گے۔

(ماں ایک کرسی اٹھا کر چارپائی کے بالکل قریب لے جاتی ہے۔ کسی قدر دور سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے)

آگئے ہیں۔ ٹھیک طرح بیٹھ جا!

زرینہ: اور کس طرح بیٹھوں۔

(زرینہ تکیے سے پشت ہٹا لیتی ہے۔ ماں باہر والے دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی ہے۔ ہمسائی آتی ہے اور دروازے کا پردہ ہٹاتی ہے۔ ڈاکٹر آتا ہے۔

اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس۔ آنکھوں پر عینک، صحت نہایت اچھی، عمر کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

ڈاکٹر کی جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کے چہرے کی خشونت ہے۔

ڈاکٹر اندر آتا ہے تو ماں ادب سے سلام کرتی ہے۔ ڈاکٹر سر کو ذرا سا خم دے کر جواب دیتا ہے اور زرینہ کی

طرف جانے لگتا ہے۔ ڈاکٹر کے پیچھے اس کا ڈرائیور دواؤں وغیرہ کا بیگ لے کر آتا ہے۔ اور آگے بڑھ کر تپائی کے اوپر رکھ دیتا ہے۔

ہمسائی بھی چارپائی کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

ماں: ڈاکٹر صاحب! ایک سال سے اس کا معدہ خراب رہتا ہے۔ کوئی چیز ہضم نہیں کر سکتی۔ بدن میں بھی درد رہتا ہے۔

ڈاکٹر: ایک سال سے!

ماں: جی ہاں کبھی بخار بھی ہو جاتا ہے۔

(ڈاکٹر ہاتھ بڑھاتا ہے اور زرینہ کی نبض دیکھتا ہے۔

ماں ایک کرسی ڈاکٹر کے قریب رکھ دیتی ہے۔ مگر ڈاکٹر کھڑا ہی رہتا ہے۔ زرینہ کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔

جیب سے سٹیتھسکوپ نکالتا ہے)

ڈاکٹر: (صحن والے دروازے کی طرف اشارہ کر کے) ادھر رخ کر کے بیٹھ جاؤ۔

(زرینہ ادھر رخ کر کے بیٹھنے ہی لگتی ہے کہ دروازے پر باپ آتا ہے۔ ڈاکٹر کو دیکھتا ہے تو ایک دم ٹھٹھک جاتا ہے ڈاکٹر پر نظر جمائے آگے بڑھنے لگتا ہے اور کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک جاتا ہے۔

ڈاکٹر زرینہ کے رخ پھیرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اسے باپ کے آنے کی کوئی خبر نہیں)

باپ: (لہجے میں تحکم) زرینہ!

(باپ کی آواز اس فضا میں حیران کن اور اجنبی لگتی ہے۔

سب مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں ۔ ڈاکٹر نے ابھی مڑ کر نہیں دیکھا ۔ زرینہ خوف زدہ ہو کر باپ کو دیکھتی ہے ۔
باپ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے)

زرینہ اٹھو۔۔۔۔ باہر چلی جاؤ!

(سب کو اتنی حیرت ہو رہی ہے کہ کسی کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلتا ۔ زرینہ شش و پنج کے عالم میں مبتلا ہے ۔ باپ زیادہ تحکم اور غصے سے کہتا ہے)
میں کہہ رہا ہوں زرینہ ! صحن میں جاؤ!

ہمسائی : بھائی صاحب!

ماں : آپ۔۔۔؟

(زرینہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے ۔ باپ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگتی ہے)

باپ : (ڈاکٹر کی طرف اشارہ کر کے) اس شخص کو کس نے یہاں بلایا ہے ؟

(ڈاکٹر اور باپ کی آنکھیں چار ہوتی ہیں ۔ تین چار لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں ۔ پھر ڈاکٹر ڈرائیور کی طرف دیکھتا ہے)

ڈاکٹر : ڈرائیور ! بیگ اٹھاؤ ۔

(ڈرائیور تپائی پر سے بیگ اٹھا لیتا ہے ۔ ڈاکٹر باہر والے دروازے کی طرف جانے لگتا ہے ۔ ڈرائیور بھی اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگتا ہے ۔

ڈاکٹر دروازے پر پہنچا ہی ہے کہ باپ جیب سے چند نوٹ نکال کر ڈرائیور کو دینے لگتا ہے)

باپ : فیس !

(ڈاکٹر دروازے پر رک جاتا ہے)

ڈاکٹر : پٹرول کے پیسے لے لو۔

(یہ کہہ کر ڈاکٹر تیزی سے دروازے میں سے نکل جاتا ہے۔ ڈرائیور ایک نوٹ لے کر باقی تمام نوٹ قریب پڑی ہوئی کرسی پر رکھ دیتا ہے اور جلدی سے باہر چلا جاتا ہے۔ دو تین لمحے خاموشی ایک بھاری بوجھ کی طرح طاری رہتی ہے)

ہمسائی : بھائی صاحب !

ماں : کیا ہو گیا ہے آپ کو ! آپ نے یہ کیا کر دیا ہے۔

باپ : جانتی نہیں یہ کون تھا ؟

ہمسائی اور ماں (ایک ساتھ) کون تھا ؟

باپ میرا دشمن !

ہمسائی : دشمن ؟

باپ : جس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو ایک دشمن بھی اپنے دشمن کے ساتھ نہیں کرتا۔ جس نے مجھے گھر سے نکال دیا اور اس دنیا میں تنہا چھوڑ دیا۔

ماں : تو یہ تھا آپ کا ـــــ

باپ : ہاں وہی۔

ہمسائی : میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا ۔

باپ : (بیوی کی طرف اشارہ کر کے) یہ جانتی ہے ۔

(باپ صحن والے دروازے میں سے نکل جاتا ہے ۔ زرینہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی ہے پھر گاؤ تکیے پر اپنا سر رکھ دیتی ہے ۔

ہمسائی ماں کو استفسار طلب نگاہوں سے مسلسل دیکھ رہی ہے ۔

ہمسائی : یہ قصہ کیا ہے ؟

ماں : بڑا بھائی ہے ان کا ۔

ہمسائی : بڑا بھائی بڑا ۔ بھا ۔ ئی ؟

ماں : ہاں ۔ دونوں سگے بھائی ہیں ۔

ہمسائی : یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے ؟

ماں : مجھے انہوں نے کچھ زیادہ نہیں بتایا ۔ صرف یہ بتایا تھا کہ باپ کے مرنے پر یہ بڑے بھائی کے ہاں رہنے لگے تھے ۔ مگر بڑے بھائی میں بڑے بھائیوں جیسا پیار مروت نہیں تھی ۔ بری طرح جھڑکتا رہتا تھا ۔ ایک دن اس نے اس بری طرح جھڑکا کہ یہ گھر سے نکل آئے اور پھر کبھی اس دروازے پر نہیں پہنچے ۔

ہمسائی : اس مدت میں ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی ۔

ماں : کیسے ہو سکتی تھی ۔ یہ شہر بہ شہر گھومتے رہے اور اس سے ملنا چاہتے بھی نہ تھے ۔

ہمسائی : گھر سے کب نکلے تھے؟

ماں : نوجوانی کے زمانے میں ۔

ہمسائی : اتنی دشمنی کہ بڑے بھائی کی بے عزتی کر دی ۔

ماں : اور بڑے بھائی نے کیا کیا تھا یہ بھی تو دیکھو کہتے تھے میں نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں ، بار بار فاقے کیے ، در در کی ٹھوکریں کھائیں ۔

ہمسائی : ڈاکٹر صاحب کی تو شہر میں بڑی عزت ہے ۔

ماں : ہوگی ، مگر چھوٹے بھائی پر تو اس نے بہت بڑا ظلم کیا تھا ۔ یہ بات کون جانتا ہے !

(ماں کی نظر زرینہ پر پڑتی ہے اس نے تکیے پر سر رکھ کر باہیں اس کے گرد پھیلا رکھی ہیں)

زرینہ !

(زرینہ کوئی جواب نہیں دیتی ۔ ماں اس کی طرف جاتی ہے ۔ اس کا جسم کانپ رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سسکیاں بھر رہی ہے ۔
ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے)

کیوں زرینہ بیٹی !

ہمسائی : تجھے کیا ہوا زرینہ !

ماں : زرینہ ! — اچھی بیٹی — میری راتو ! — زرینہ ! !

(اور اسی عالم میں پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر :

وہی کمرہ ۔ رات کا ابتدائی حصہ ۔
اس وقت سٹیج پر ڈاکٹر اور باپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ۔ دونوں ایک دوسرے کو اس انداز سے دیکھ رہے ہیں جیسے ابھی ابھی ملے ہیں اور گفتگو کا آغاز نہیں ہوا ۔
باپ ایک کرسی کے پاس کھڑا ہے اور بے تابی کے عالم میں اُس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں کرسی کے بازو پر پھر رہی ہیں ۔
ڈاکٹر اُس کے سامنے کھڑا ہے ۔ ہونٹوں میں سگار ہے ۔

ڈاکٹر : آصف !

باپ : میرے یہاں کیوں آئے ہو ۔ تمھارا یہاں کیا کام ؟

ڈاکٹر : اس وقت میں تمھارے بڑے بھائی کی حیثیت سے آیا ہوں ۔

باپ : تم اور میرے بھائی ؟

ڈاکٹر : تمھیں اس سے انکار ہے ۔

باپ : ایک بھائی اپنے بھائی کو گھر سے نہیں نکال سکتا ۔ تم نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا ۔

ڈاکٹر : یہ تم کہہ رہے ہو مگر میں نے تمھیں ہرگز گھر سے نہیں نکالا تھا ۔

باپ : تو پھر میں یونہی سالہاسال شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ گھومتا رہا ۔ میں تمھارے لیے مر چکا ہوں ۔ اور تم میرے لیے اُس وقت مر گئے تھے جب تم نے

مجھ سے کہا تھا کہ گھر سے نکل جاؤ۔ اور میں ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل آیا تھا۔ ہمارے درمیان کسی قسم کا رشتہ سلامت نہیں رہا۔

ڈاکٹر: آصف!

باپ: تمھیں اس طرح مجھے مخاطب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

ڈاکٹر: (نرمی سے) دیکھو آصف!

باپ: کیا تم اس وجہ سے مجھ پر رعب جمانا چاہتے ہو کہ تم آج ایک مشہور ڈاکٹر ہو۔

ڈاکٹر: آصف! میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میں اس وقت ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں، تمھارے بھائی کی حیثیت سے آیا ہوں۔ تمھیں وہ حقیقت بتانا چاہتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

باپ: کون سی حقیقت؟

ڈاکٹر: اگر تم یہ حقیقت جانتے ہوتے تو آج تم بھی ایک مختلف شخص ہوتے۔

باپ: میں پوچھتا ہوں تم کونسی حقیقت بتانے آئے ہو۔

ڈاکٹر: ہم دونوں نے ایک غریب گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ تم جانتے ہو ہمارے والد ایک مشہور حکیم تھے۔ ان کے یہاں صبح و شام مریضوں کا تانتا بندھا

رہتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے یہاں غربت رہتی تھی۔

باپ: اس کے ذکر کی ضرورت؟

ڈاکٹر: (سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے) اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے بامروت انسان تھے۔ مریضوں سے دواؤں کی قیمت تک نہیں لیتے تھے۔ ہماری ماں ہر روز چیختی تھیں اور اُن کی اس عادت کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ مگر اُن پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا تھا۔ آخرکار وہ بیمار ہو گئیں۔ اور ایک دن چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

(ڈاکٹر ذرا رکتا ہے۔ سگار کا کش لیتا ہے)

جس دن وہ فوت ہوئیں گھر میں کفن کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ ان کی نعش گھر کے دالان میں پڑی تھی اور والد شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ تمہیں اس معاملے کی خبر نہیں ہے کیونکہ تم اُس وقت سات سال کے بچے تھے اور میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ ایک باشعور اور حساس نوجوان کے لیئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی ماں کو گھر سے کفن تک نہ مل سکے اور وہ اسی حالت میں گھر کے اندر پڑی رہے۔ میں ماں کی بے عزتی اور باپ کی پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ اور لگتا تھا جیسے میرے ذہن میں گرم گرم نشتر سے

چپ رہے ہیں ۔ شام تک ماں دالان میں پڑی رہی ۔ پھر ہمسایوں نے چندہ اکھٹا کیا اور جنازہ اٹھا ۔

(باپ ٹکٹکی باندھ کر ڈاکٹر کو دیکھ رہا ہے ۔ ڈاکٹر دو تین لمحوں کے لیے رکتا ہے اور پھر بولنے لگتا ہے)

یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا ۔ مگر والد صاحب نے اس سے کوئی سبق نہ سیکھا ۔ ان کی زندگی میں کسی قسم کی سنجیدگی بھی نہ آ سکی اور یہ چیز میرے لیے سوہان روح ثابت ہوئی ۔ جب تک وہ جیئے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ۔ اور جب وہ فوت ہوئے تو میں ایک کمپونڈر تھا اور تم ایک نقشہ نویس کے یہاں کام کر رہے تھے ۔ ایک دن میں نے سنا کہ تم لوگوں کو مفت نقشے بنا کر دیتے رہے ہو ۔ اتنا سننا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ۔ مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ تم بھی باپ کے راستے پر جا رہے ہو اور اس سے پہلے کہ تم بہت آگے جاؤ میں نے تمھیں سختی کے ساتھ کہہ دیا کہ اپنے پیشے کا احترام کرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے ۔ تم نے سنی ان سنی کر دی ۔ دن گزرتے گئے اور تمھاری عادت بڑھتی گئی ۔ یہاں تک کہ وہ رات آئی جب میں نے تمھیں چیلنج دے دیا کہ اگر تم اپنی عادت سے باز نہ آئے تو تمھیں گھر سے نکال دوں گا ۔

میں نے دھمکی دی تھی ۔ لیکن تم آدھی رات کے قریب
اٹھے اور گھر سے نکل گئے ۔

(دو تین لمحوں کے لیے ڈاکٹر خاموش ہو جاتا ہے)

میں نے تمھیں کتنا ڈھونڈا ۔ یہ میں جانتا ہوں ۔
آخر تم سے مایوس ہو گیا اور اپنی ساری توجہ تعلیم
پر لگا دی ۔ آصف !

باپ : ہوں !

ڈاکٹر : کیا تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمھارے متعلق
جو رویہ اختیار کیا تھا وہ درست نہیں تھا ؟

باپ : یہ حقیقت تم نے اس وقت کیوں نہ بتائی ؟

ڈاکٹر : اُس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی ۔ مجھے
زندگی سے ڈر لگتا تھا ۔ ہر وقت دل میں کچوکے سے
لگتے رہتے تھے ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی حالت
میں تمھیں بھی شریک کروں !

باپ : میں نے تو تمھیں ایک ظالم بھائی سمجھا تھا ۔

ڈاکٹر : حالانکہ اُس وقت میں ایک بڑی مظلوم ہستی تھا ۔
جب تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا تو میں نے جو کچھ
گزرا تھا اُس پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کر دیا اور
اس نتیجے پر پہنچا کہ چند اصولوں کو اپنائے بغیر
زندگی بے معنی ہو جاتی ہے اور انہی اصولوں نے مجھے

زندگی دی ــــ بلکہ نئی زندگی دی ! خیر یہ میرا اپنا معاملہ ہے ۔ تم کہو تمھاری کیا رائے ہے ؟

باپ : مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے !

ڈاکٹر : واقعی !

باپ : ہاں !

ڈاکٹر : آصف !

باپ : بھائی جان !

ڈاکٹر : یہ لفظ کتنی مدت کے بعد میں نے سنے ہیں ۔ ''بھائی جان،،

باپ : بھائی جان !

(باپ آگے بڑھتا ہے اور دوبارہ بھائی جان کہہ کر ڈاکٹر سے لپٹ جاتا ہے ۔ ڈاکٹر اپنے بازو اُس کے گرد پھیلا دیتا ہے)

ڈاکٹر : آصف ! اچھے بھائی ۔

(باپ الگ ہو جاتا ہے ۔ جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھتا ہے ۔ ڈاکٹر بار بار آنکھیں جھپکاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آنسو ضبط کر رہا ہے ۔

باپ صحن والے دروازے کی طرف جاتا ہے اور آواز دیتا ہے ۔ ''حمیدہ،، ۔ باپ اور ڈاکٹر دونوں اس دروازے کی طرف دیکھتے ہیں ۔ حمیدہ اور زرینہ دونوں دروازے پر آتی ہیں اور رک جاتی ہیں)

باپ : آؤ ــ

(دونوں اندر آتی ہیں جھجکتی ہوئی)

حمیدہ ! میرے بھائی جان سے ملو ۔

(حمیدہ اور زرینہ حیرت انگیز مسرت سے پہلے باپ کو اور پھر ڈاکٹر کو دیکھتی ہیں)

ڈاکٹر : ہم میں ایک غلط فہمی تھی جو دور ہوگئی ہے ۔

ماں : اوہ ـــ سلام علیکم ـــ بھائی جان !

زرینہ : تایا جان سلام علیکم ۔

ڈاکٹر : وعلیکم السلام ۔

(ڈاکٹر آگے بڑھ کر بڑی محبت اور شفقت سے زرینہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے اور پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر :

اس منظر کا پردہ دوسری صبح کو دس بجے اٹھتا ہے ۔
کمرے میں اس وقت گھر کے تینوں افراد کے علاوہ ہمسائی بھی ہے ۔ باپ چارپائی کے پاس کھڑا ہے اور سگریٹ سلگا رہا ہے ۔
زرینہ چارپائی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی ہے ۔ ہاتھ میں پرس ہے ۔
ماں ہمسائی سے محو گفتگو ہے ۔

ہمسائی : کمال ہے ۔

ماں : دیکھ او ـــ دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے ۔

ہمسائی : ایک بات تو ضرور کہوں گی ۔ قصور زرینہ کے ابا ہی کا ہے ۔ ان کے بھائی نے تو ان کا بھلا چاہا تھا ۔

باپ : اس میں شک ہی کیا ہے ۔

همسائی : چلو انجام بہت اچھا ہوا ۔

ماں : اچھا انجام ہوا ۔ اب میری بچی کو آرام آ جائے تو بہت اچھی بات ہوگی ۔

همسائی : ڈاکٹر تمہارے گھر کا ہے ۔

زرینہ : میرے تایا جان ہیں ۔

همسائی : جی ہاں تمہارے تایا جان ہیں ۔

زرینہ : اور خالہ جان ! رات جاتے ہوئے مجھے یہ دے گئے ہیں ۔

(زرینہ پرس دکھاتی ہے)

همسائی : اس میں کیا ہے ؟

ماں : ایک ہزار کے نوٹ ۔

همسائی : واہ واہ — تمہارے تو وارے نیارے ہوگئے بھئی !

باپ : دس بج گئے ہیں ، آ ہی رہے ہوں گے ۔

همسائی : کون — ڈاکٹر صاحب ۔

باپ : ہمارے بھائی جان ۔

ماں : زرینہ بیٹی ٹھیک ٹھاک ہو کر بیٹھ جا ۔

زرینہ : ٹھیک ہی تو بیٹھی ہوں ۔

(زرینہ اٹھ کر ٹانگیں چارپائی کے نیچے لٹکا دیتی ہے ۔ باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے)

همسائی : آ گئے زرینہ کے تایا جان ۔

(باپ باہر والے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ پردہ ہٹاتا ہے ڈاکٹر اندر آتا ہے۔ چہرے پر وہی خشونت جو پہلے منظر میں تھی۔

باپ : سلام علیکم بھائی جان۔

ماں : سلام علیکم بھائی جان۔

زرینہ : تایا جان سلام علیکم۔

(ڈاکٹر سر کے ہلکے سے خم سے سب کا جواب دیتا ہے۔ اور زرینہ کی طرف بڑھتا ہے۔ دروازے میں سے بیگ اٹھائے ڈرائیور آتا ہے۔ اور ڈاکٹر کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر : کیا تکلیف ہے اسے؟

(ڈاکٹر کے رویے سے سب حیران ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتا)

ڈاکٹر : میں نے پوچھا ہے کیا تکلیف ہے اس لڑکی کو!

ماں : جی!

ڈاکٹر : لڑکی کو تکلیف ہے یا نہیں؟

ماں : جی ہاں۔

ڈاکٹر : تو بتائیے۔

ماں : بھائی جان ــــ

ڈاکٹر : تکلیف بتائیے!

ماں : جسم میں درد رہتا ہے۔ ہاضمہ بہت کمزور ہے۔

(ڈاکٹر زرینہ کی نبض دیکھتا ہے۔ پھر اس کی پیٹھ پر سٹیتھوسکوپ لگاتا ہے)

ایکسرے کرایا ؟

ماں : پچھلے سال کرایا تھا ۔

ڈاکٹر : نیا کروائیے ۔

(ڈاکٹر سٹیتھسکوپ ہٹا کر جیب میں رکھتا ہے اور نسخہ لکھنے لگتا ہے ۔ سب پر ایک تشویشناک حیرت چھائی ہوئی ہے ۔

نسخہ لکھ کر ماں کے حوالے کرتا ہے

شربت ـــــ چائے والا چمچ صبح ، دوپہر اور شام ۔ گولیاں دو صبح ، دو سوتے وقت ، ٹیکے ایکسرے دیکھ کر کروں گا ۔

(ڈاکٹر باہر والے دروازے کی طرف جانے لگتا ہے ۔ رک کر ڈرائیور کی طرف دیکھتا ہے)

ڈرائیور !

ڈرائیور : جی !

ڈاکٹر : فیس لو !

(یہ کہہ کر ڈاکٹر دروازے میں سے نکل جاتا ہے ۔ ڈرائیور باپ کی طرف بڑھتا ہے)

ڈرائیور : ڈاکٹر صاحب کی فیس ۔

باپ : فیس !

ڈرائیور : سولہ روپے !

(باپ حیران و پریشان جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالتا ہے ۔ ڈرائیور کو دیتا ہے ۔ ڈرائیور شکریہ کہہ کر ڈاکٹر کے پیچھے چلا جاتا ہے)

ماں : یہ معاملہ کیا ہے ؟

باپ : میری تو سمجھ میں خاک نہیں آیا ۔

زرینہ : ابو کیا یہ رات والے تایا جی تھے ! ابو ۔۔۔

زرینہ باپ کو دیکھتی ہے ۔۔۔ ماں بھی اسے دیکھتی ہے ۔۔۔ ماحول میں ایک بوجھل خاموشی چھا گئی ہے اور اسی حالت میں پردہ گرنے لگتا ہے ۔

——:0 0:——

صوفہ

کردار :-

○ احمد نیازی
○ آکرم
○ راشدہ
○ خانم

منظر :

ایک خاصا کشادہ ، سجا سجایا کمرہ ، فرنیچر سے مزین ۔

سرما کا آغاز ۔ وقت : دن کا تیسرا پہر ۔ شام ہونے ہی والی ہے ۔

سامنے دیوار کے ساتھ انگیٹھی ۔ جس پر ٹائم پیس ۔ تازہ پھولوں سے آراستہ دو گلدان ۔ ان کے علاوہ سجاوٹ کی کچھ چیزیں ۔

انگیٹھی سے کچھ دور ، دائیں جانب دالان میں کھلنے والا دروازہ ۔ دالان ہی میں اوپر جانے والی سیڑھی بھی ہے ۔

دوسرا دروازہ راشدہ اور اکرم کی خواب گاہ کے سامنے بائیں دیوار میں اس جگہ واقع ہے جہاں اس سے آگے کچھ فاصلے پر ایک جلا ہوا صوفہ دکھائی دے رہا ہے ۔ یہ صوفہ نصف کے قریب جل چکا ہے ۔ صوفے کے پاس ایک تپائی کے اوپر استری پڑی ہے ۔

صوفے کے پاس احمد نیازی ، راشدہ اور اکرم کھڑے ہیں اور اس کے جلے ہوئے حصے کو دیکھ رہے ہیں ۔

احمد نیازی اڈھیڑ عمر کے آدمی ہیں ۔ جسم بھرا بھرا ۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی ، آنکھوں پر چشمہ ، منہ میں سگار جس

کے کش کم لیتے ہیں اور عادتاً ہونٹوں میں زیادہ تھامے رکھتے ہیں۔ لباس: شلوار، اچکن، سر پر جناح کیپ، دائیں ہاتھ میں ایک موٹی چھڑی جسے غور و فکر کی حالت میں فرش پر یا جو چیز بھی سامنے ہو، آہستہ آہستہ مارتے رہتے ہیں۔

راشدہ عمر بیس بائیس برس، خاصی قبول صورت، گلابی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس، چہرے پر ہوائیں۔ بدن تھرکتا رہتا ہے۔ ایک جگہ قرار نہیں ہے۔

اکرم راشدہ کا شوہر بیوی سے تین برس بڑا۔ پتلون اور قمیض پہنے ہوئے۔

نیازی: (اکرم سے) تو اکرم بیٹا! یہ حادثہ ہوا کیسے!

اکرم: (راشدہ کی طرف اشارہ کرکے) ان سے پوچھئے چچا جان۔

نیازی: کیوں راشدہ بیٹی؟

راشدہ: میں کیا بتاؤں۔

اکرم: تم نہیں بتاؤگی تو اور کون بتائے گا!

راشدہ: دیکھیے چچا جان۔ ایک تو میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ ایسی باتیں کرکے مجھے اور پریشان کر رہے ہیں یہ۔

اکرم: کیسی باتیں کر رہا ہوں۔ یہی پوچھا ہے نا کہ صوفہ کس طرح جل گیا!

نیازی: اس کا سادہ جواب تو یہ ہے کہ صوفے کو جلنا تھا۔ جل گیا۔ راشدہ! تم یہ بات کیوں نہیں کہہ

دیتیں ۔ ارے بھئی کہہ بھی دو ۔ کہہ دو نا ۔

(راشدہ جو شوہر کے تلخ لہجے پر مضطرب ہو گئی تھی اب ذرا سنبھل کر مسکرانے لگتی ہے)

اکرم : ہاں چچا جان ! یہ جواب بالکل ٹھیک ہے ۔ جس حادثے کو ہونا ہے وہ تو بہر صورت ہو کر ہی رہتا ہے ۔

نیازی : بالکل ۔

اکرم : اگر مکان کو آگ لگ جاتی اس وقت بھی یہی جواب دیا جا سکتا تھا کہ مکان کو جلنا تھا ـــــ

نیازی : (ہاتھ میں چھڑی گھما کر) جل گیا ۔

(راشدہ بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

اکرم : لیجیے چچا جان ! راشدہ ہنس رہی ہے ۔ گویا کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں ۔

نیازی : آخر ہنسنے میں کیا برائی ہے ۔ ہنسنے دو اسے اور خود بھی ہنس سکتے ہو تو ہنسو ۔ کون روکتا ہے تمہیں ؟

اکرم : میں کیوں ہنسوں ۔

نیازی : تو نہ ہنسو ۔

اکرم : چچا جان ملاحظہ فرمائیے ۔ کتنا بڑا حادثہ ہوا ہے ۔

نیازی : حادثہ تو واقعی بڑا ہے ۔

اکرم : اور یہ راشدہ ـــــــ

راشدہ : (الفاظ کاٹتے ہوئے) میں کیا کہتی ہوں، آپ سے ۔

نیازی : مجھے یہ بتاؤ راشدہ! کہ واقعہ ہوا کیونکر!

راشدہ : (شوہر کی طرف اشارہ کر کے) یہ کیوں نہ بتائیں !

اکرم : ذمے دار کون ہے اس حادثے کا !

راشدہ : درست کہتے ہیں آپ ۔ مجرم میں ہی ہوں!

نیازی : میں کسی کو مجرم نہیں سمجھتا ۔ کم از کم اس وقت نہیں سمجھتا ۔ پورا قصہ سننے کے بعد ممکن ہے میری رائے بدل جائے ۔ مگر مشکل یہ ہے کہ شاید تم دونوں مجھے سارا واقعہ نہیں سناؤ گے ـــ راشدہ !

راشدہ : جی !

نیازی : اوپر سے اپنی امی کو بلا لاؤ ۔

اکرم : میں بتاتا ہوں چچا جان ! کل رات کا واقعہ ہے ۔ راشدہ کی سہیلی کا نکاح تھا ۔ ہم دونوں مدعو تھے ۔

نیازی : تمھاری ساس نہیں تھی مدعو ۔

اکرم : جی نہیں خالہ جان نہیں تھیں ۔ ہم سات ساڑھے سات روانہ ہو گئے ۔ گیارہ بجے محلے کا ایک آدمی وہاں پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی ہے ۔ اسی وقت واپس آ گئے ۔ یہاں محلے کے کئی لوگ موجود تھے ۔ معلوم یہ ہوا کہ صوفے

کو آگ لگ گئی تھی ۔ اتفاق سے اس وقت مستری عمر دین گلی سے گزر رہا تھا ۔ اس نے جو ہمارے کمرے کے روشندانوں میں سے دھوئیں کے بادل نکلتے ہوئے دیکھے تو آگ آگ کہتے ہوئے دروازے کی طرف لپکا ۔ خالہ جان نے دروازہ کھول دیا ۔ اندر آ کر دیکھا تو صوفہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا اتنے میں اور لوگ بھی آگئے اور آگ بجھا دی گئی ۔

نیازی : خانم کہاں تھیں !

راشدہ : امی تو اوپر کے کمرے میں ہوتی ہیں ۔

نیازی ! انہیں آگ کا علم کس وقت ہوا ؟

اکرم : جب مستری عمر دین دروازے پر آیا اور اس نے بتایا کہ مکان کو آگ لگ گئی ہے ۔

نیازی : آگ لگی کیونکر ؟

اکرام : (راشدہ سے) اب تو تم بتا دو !

راشدہ : چچا جان میں نے شام کے وقت اپنی قمیص پر استری کی تھی ۔

اکرم : اور یہ بھی کہو نا کہ بجلی کا شو پلگ سے نکالنا یاد نہیں رہا تھا اور استری صوفے پر رکھ دی تھی ۔

راشدہ : ہاں ۔

اکرم : استری صوفے پر پڑی رہی اور صوفے کو آگ لگ گئی ۔

نیازی : جہاں تک میں سمجھتا ہوں راشدہ بڑی محتاط لڑکی ہے ۔

اکرم : میرا بھی یہی خیال ہے ۔ یہ اس گھر میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے اور شاید آخری ۔۔۔

(راشدہ سر جھکا کر سوچنے لگتی ہے)

نیازی : راشدہ کیا سوچ رہی ہو تم !

راشدہ : کچھ نہیں چچا جان ۔

اکرم : کہتی ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے وہ شو پلگ سے نکال دیا تھا اور استری تپائی پر رکھ دی تھی ۔

نیازی : ممکن ہے اس نے ایسا سوچا ہو ، مگر اس پر عمل نہ کیا ہو !

راشدہ : چچا جان !

(نیازی کی طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہتی نہیں)

نیازی : کہو !

راشدہ : کچھ نہیں ۔

نیازی : کچھ کہنا تو چاہتی تھی تم !

راشدہ : معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب کچھ میں نے خواب

میں کیا تھا۔

نیازی : کیا سب کچھ

اکرم : یہی شو پلنگ میں سے نکالنا اور استری کو تپائی کے اوپر رکھنا یہ صرف ایک خواب تھا اور کچھ نہیں۔

نیازی : راشدہ بیٹی ! کبھی کبھی یوں بھی تو ہو جاتا ہے کہ انسان سوچتا ہے ابھی اٹھ کر یہ کام کرتا ہوں وہ کام کرتا ہوں اور یہ خیال اس کے ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے جو کچھ سوچا گیا ہے وہ کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہوتی یہی ماجرا تمہارے ساتھ بھی ہوا ہے۔

راشدہ : مجھے یاد پڑتا ہے کہ قمیص اٹھانے سے پہلے ہی میں نے شو اتار دیا تھا۔

اکرم : اتار دیا ہوتا تو صوفے کو آگ کس طرح لگتی۔ کیا آگ لگنے کا واقعہ ثابت نہیں کرتا کہ جو کچھ تمہیں کرنا چاہیے تھا وہ تم نے کیا نہیں تھا۔

راشدہ : درست کہتے ہیں آپ!

اکرم : کیا اب بھی شک ہے تمہیں ؟

راشدہ : اب خدا کے لیے ختم کیجیے اس قصے کو، میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے۔

اکرم : تم سے کس نے کہا ہے کہ غلطی کا اعتراف کرو ذرا سی بے احتیاطی ہو گئی ہے اور یہ ہر انسان سے

ہو جاتی ہے۔ کیوں چچا جان۔

نیازی: اس میں کیا شک ہے؟

(دو تین لمحوں کے لیے خاموشی رہتی ہے جس میں تینوں صوفے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ راشدہ نیازی کے قریب تر ہو جاتی ہے)

راشدہ: چچا جان! امی پر اس کا بہت برا اثر ہوا ہے۔ کل سے بہت افسردہ اور خاموش ہیں۔

اکرم: میں نے ان سے کئی بار کہا ہے ”خالہ جان! خدا کا شکر ادا کیجیے کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ مکان کو آگ لگ جاتی تو بہت برا ہوتا۔ ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑتا۔ مگر ان کی طبیعت ہے کہ ابھی تک بحال نہیں ہوئی۔

نیازی: اس وقت اوپر کیا کر رہی ہیں۔

اکرم: خبر نہیں۔

نیازی: بھئی بلایا ہوتا انہیں۔ میرے آنے کی اطلاع دے دی ہے؟

راشدہ: میں نے کہہ دیا تھا۔ چچا نیازی صاحب تشریف لائے ہیں۔ ممکن ہے چائے بنا رہی ہوں۔

نیازی: جاؤ جا کر دیکھو۔

(راشدہ دلان والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ ابھی وہ دروازے سے کچھ دور ہے کہ خانم آتی ہے۔)

سن پینتالیس کے لگ بھگ۔ چھریرا بدن۔ شلوار، قمیص،

سویٹر اور چادر میں ملبوس ؛ ھاتھ میں چائے کے سامان کی ٹرے)

راشدہ : امی یہ آپ کیا کرتی ھیں ۔ توبہ میری ۔

(راشدہ تیزی سے ماں کی طرف جاتی ہے اور ٹرے آٹھا لیتی ہے ۔ خانم کو آتے دیکھ کر نیازی صوفے سے آگے بڑھ کر خانم کا خیر مقدم کرتے ھیں ۔

خانم کے چہرے پر ایک عجیب آداس مسکراہٹ پھیلی ہے)

خانم : سلام علیکم بھائی جان ۔

نیازی : وعلیکم السلام ۔ مبارک ھو خانم !

(خانم ادھر آ رہی ہے ۔ راشدہ ٹرے میز پر رکھ کر چائے بنانے لگتی ہے)

خانم : مبارک ؟

نیازی : کیوں یہ مبارک کا موقع نہیں ہے ۔ صرف صوفہ جلا ۔ مکان کو آگ لگ جاتی تو بہت برا ھوتا ——— کتنا نقصان ھوتا تم لوگوں کا !

خانم : جی ھاں ۔

نیازی : تو کیا یہ مبارک کا موقع نہیں ؟

خانم : جی ھاں تشریف رکھیں نا بھائی جان ۔

نیازی : (کرسی پر بیٹھے ھوئے) کچھ دیر پہلے حمید نے مجھے بتایا کہ تمھارے یہاں یہ حادثہ ھوا ہے ۔

خانم : جی ——— راشدہ ! چائے بناؤ نا ۔

نیازی : بنا تو رہی ہے ۔

راشدہ : چچا جان ! کے چمچ !

نیازی : بھول گئی ہو ــــ

راشدہ : پریشان ہوں نا چچا جان ۔

نیازی : پریشان تو تمھاری امی ہیں ۔

راشدہ : انہیں کی وجہ سے میں پریشان ہوں ۔

نیازی : خانم ! کیا کہتی ہے راشدہ !

اکرم : خالہ جان کو اتنا گہرا تاثر قبول نہیں کرنا چاہیے تھا آخر ہوا کیا ہے ۔ آپ بزرگ ہیں چچا جان سمجھائیے انہیں میں تو کہہ کہہ کر تھک گیا ہوں ۔

نیازی : کوئی بات نہیں ۔ (مسکرا کر) یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہیں کہ اگر مکان جل جاتا تو کیا ہوتا ـــــ

(اکرم چائے کی پیالی اور بسکٹوں والی پلیٹ لے کر نیازی کی طرف آتا ہے ۔ نیازی ادھ جلا سگار فرش سے رگڑ بجھا دیتے ہیں اور پھر اسے ایش ٹرے میں رکھنے لگتے ہیں)

اکرم : چچا جان !

نیازی : صرف چائے بھئی ـــ (پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے) یہ نہیں ۔

اکرم : (خانم سے) خالہ جان ! آپ چائے پئیں گی نا ۔

خانم : نہیں !

راشدہ : امی لیجیے نا ۔ میں نے بنا دی ہے آپ کے لیے ۔

(راشدہ چائے کی پیالی لیے ماں کی طرف آتی ہے اور پیالی اس کے ہاتھ میں دے دیتی ہے)

خانم : پریشان کر دیتی ہے یہ لڑکی ۔

اکرم : جی ہاں !

(راشدہ گرم نگاہوں سے شوہر کو دیکھتی ہے)

نیازی : پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ۔ سب کچھ ٹھیک ہے ۔ بات کا بتنگڑ کیوں بناتے ہو اکرم !۔۔۔ خانم !

(خانم چائے کے لمبے لمبے گھونٹ لے رہی ہے)

راشدہ : امی ۔

خانم : ٹھیک ہے میں پریشان نہیں ہوں ۔

نیازی : (غور سے دیکھتے ہوئے) خانم ۔

خانم : مجھ سے کہا ہے کچھ ؟

نیازی : تم نے صوفے پر استری نہیں دیکھی تھی ۔ میرا مطلب ہے ان لوگوں سے جانے کے بعد ۔

خانم : کیا ؟ استری ؟

(خانم استری کر دیکھتی ہے)

یہ کمبخت ابھی تک یہاں پڑی ہے ؟

راشدہ : امی ابھی لے جاتی ہوں اپنے کمرے میں ۔

(راشدہ جلدی سے پیالی میز پر رکھ کر استری اٹھا کر صوفے والے دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

نیازی : خانم میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تم اس خوشی میں مٹھائی کھلاؤ گی مگر تم تو اسے بری طرح محسوس کر رہی ہو ۔

خانم : مٹھائی کا کیا ہے آپ ہر وقت کھا سکتے ہیں ۔

نیازی : نہیں ہر وقت نہیں ـــ مٹھائی کے لئے بھی ایک خاص وقت مقرر ہوتا ہے ۔

(نیازی پیالی خالی کر کے نیچے فرش پر رکھنے لگتے ہیں)

اکرم : ایک پیالی اور ـــ

نیازی : بھئی نہیں !

(راشدہ آتی ہے اور آتے ہی ماں کی طرف دیکھنے لگتی ہے جو چائے ختم کرنے کے بعد پیالی ہاتھ میں رکھے تپائی کے پاس کھڑی ہے ۔ راشدہ آگے بڑھ کر ماں کے ہاتھ سے پیالی لے لیتی ہے)

راشدہ : (شوہر سے) چچا جان کو اور چائے دیجئے ۔

اکرم : کہا تھا ۔

نیازی : نہیں بیٹی ۔ ایک ہی پیالی کافی ہے ۔

(نیازی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں جیب سے نیا سگار نکالتے ہیں اور سگار سلگاتے ہوئے صوفے کی طرف جانے لگتے ہیں ۔ خانم ان کی طرف آتی ہے ۔

(نیازی بڑے غور سے صوفے کا جائزہ لے رہے ہیں)

خانم : آپ کیا دیکھ رہے ہیں ؟

نیازی : (چھڑی سے صوفے کے ایک حصے پر چھڑی مارتے ہوئے) آگ یہاں سے شروع ہوئی تھی ۔

اکرم : آگ درمیان سے شروع ہوئی ہوگی ۔ استری ـــ کہیں صوفے کے درمیانی میں پڑی ہوگی ۔

خانم : آپ تشریف رکھیں ۔

نیازی : کافی پرانا صوفہ ہے ۔

خانم : تشریف رکھیے بھائی جان ۔

نیازی : ٹھیک ٹھیک ۔

خانم : بھائی جان آپ تشریف کیوں نہیں رکھتے ۔

(راشدہ اور اکرم نیازی کو دیکھتے ہیں)

راشدہ : چچا جان ! امی کہتی ہیں آپ تشریف رکھیں !

نیازی : اچھا صوفہ تھا — پرانا تھا مگر خوبصورت تھا ۔

اکرام : اب تو بیکار ہو چکا ہے ۔

نیازی : نہیں — میں اب اسے لے جاؤں گا ۔

خانم : وہ کیوں !

نیازی : معلوم ہوتا ہے (مسکرا کر) ہماری بہن کو یہ صوفہ بہت پیارا لگتا ہے ۔

خانم : راشدہ اسے اوپر بھجوا دو ۔ نمائش کے لیے یہاں نہیں پڑا رہے گا ۔

نیازی : نمائش کے لیے — خوب ! مگر خام ! اب اسے رکھ کر کیا کرو گی — کیا بنوایا جا سکتا ہے ۔

فریم تو اچھی حالت میں ہے خیر — وہ کیا کہتے ہیں ۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت ۔

(نیازی صوفے سے ہٹ کر اپنی کرسی کی طرف آنے لگتے ہیں)

لو بھئی ہم چلے ۔

راشہ ماں کی طرف دیکھتی ہے کہ وہ نیازی کو روکنے کی کوشش کرے ۔ مگر وہ خاموش رہتی)

راشدہ : نہیں چچا جان !

نیازی : بیٹھ کر کیا کروں گا ؟

اکرم : کھانا کھا کر جائیے گا ۔

نیازی : یہ وقت تو گھومنے کے لئے ہے ۔

اکرم : گھومنے تو ہم بھی جائیں گے ۔

نیازی : سب کے سب ؟

راشدہ : آج تو انہیں بھی لے جاؤ ۔

خانم : میں کیا کرنے جاؤں گی ؟

نیازی : سیر اور کیا ؟

خانم : مجھے سیر ویر کا شوق نہیں ہے ۔

نیازی : اچھا تمہاری مرضی ۔

(نیازی دالان والے دروازے کی طرف بڑھنے لگتا ہے)

راشدہ : چچا جان آپ تو سچ سچ جا رہے ہیں ۔

نیازی : تو کیا مجھے جھوٹ موٹ جانا چاہیے ؟

راشدہ اور اکرم : (ایک ساتھ) سلام علیکم

نیازی : و علیکم السلام ۔

(نیازی دالان والے کمرے سے نکل جاتے ہیں)

راشدہ : امی آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں ؟

خانم : کیا روکتی — جانا چاہتے تھے — چلے گئے ۔

(خانم دالان والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

اکرم : آپ اوپر جائیں گی ؟

خانم : ہاں --- کب باہر جا رہے ہو ۔

اکرم : میں کوٹ ووٹ پہن لوں --- چلتے ہیں ۔

(اکرم خواب گاہ میں چلا جاتا ہے ۔ خانم جاتے جاتے رک جاتی ہے)

راشدہ : کیوں امی ؟

خانم : (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) یہاں ٹھیک نہیں ہے !

(راشدہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتی ۔ خواب گاہ والے دروازے کی طرف چلی جاتی ہے ۔ خانم دو تین لمحے وہاں کھڑی رہتی ہے ۔ پھر جانے لگتی ہے ۔ راشدہ اور اکرم کوٹ پہن کر آتے ہیں ۔ اور دالان والے دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں ۔ پردہ دو تین لمحوں کے لیے گر کر پھر اٹھتا ہے ۔ کمرے کے بلب روشن ہیں ۔

اب خانم کمرے میں تنہا ہے --- پردہ اٹھتے وقت وہ کمرے میں ٹہل رہی ہے ۔ یکایک اس کی نظر صوفے کے قریب جاتی ہے ۔ وہ آگے بڑھ کر اس پر جھک جاتی ہے ۔

دو تین لمحے گزر جاتے ہیں ۔

گھنٹی بجتی ہے ۔ وہ یوں چونک کر سامنے دیکھتی ہے جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے یکایک اس کی آنکھ کھل گئی ہے ۔

اپنی جگہ پر کھڑی رہتی ہے --- گھنٹی بند ہو کر پھر بجتی ہے ۔

خانم دالان والے دروازے کی طرف قدم اٹھاتی ہے ۔

چند لمحوں کے لئے سٹیج خالی ہو جاتا ہے ۔

دروازے سے خانم آتی ہے ۔ ایک لمحے کے بعد نیازی

داخل ہوتے ہیں ۔ وہ فوراً تپائی کی طرف جاتے ہیں ۔ "یہاں تو نہیں ہے" کہہ کر کرسی کی طرف رخ کرتے ہیں ۔ جھک کر لائٹر اٹھا لیتے ہیں ۔ اس دوران میں خانم تپائی سے کچھ فاصلے پر کھڑی انہیں دیکھتی رہتی ہے)

نیازی : معاف کرنا کتنی تکلیف ہوئی تمہیں !

خانم : کوئی بات نہیں بھائی جان!

نیازی : یہ تو نہ کہو ــــ بات تو ہے ۔ میں بڑا محتاط آدمی ہوں ۔ مگر کبھی کبھی اپنی چیز بھول جاتا ہوں ۔ راشدہ اور اکرم سے رخصت ہو کر ذرا آگے گیا تو سگار سلگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا ــــ مگر لائٹر غائب ۔

خانم : مل گیا نا ۔

نیازی : معلوم نہیں یہاں کس وقت رکھا تھا ۔

خانم : کسی وقت تو رکھا ہوگا ۔

نیازی : ہاں خانم ! انسان ایک عجیب چیز ہے ۔ ذرا سی غلطی کر دیتا ہے اور بعد میں اس کا کتنا بڑا خمیازہ بھگتتا ہے ۔ مجھے تکلیف ہوئی ۔ تمہیں تکلیف ہوئی ۔

خانم : خیر !

نیازی : وہ لوگ واپس کس وقت آتے ہیں ۔

خانم : نو بجے سے پہلے نہیں لوٹتے ۔

نیازی : تم کیا کر رہی تھیں اس وقت ۔

خانم : میں کیا کر رہی تھی ۔ کمرے میں نہیں تھی ۔

نیازی : (مسکرا کر) میں نے کب کہا تھا ۔ تم کمرے میں تھیں ۔

خانم : آپ نے کیا پوچھا تھا ؟

نیازی : کچھ نہیں —— کوئی خاص بات نہیں ۔

خانم : تو بیٹھیے ۔

نیازی : نہیں —— جاؤں گا ۔

(نیازی لائٹر جیب میں ڈالتے ہوئے صوفے کی طرف اس انداز سے دیکھتے ہیں ۔ جیسے وہاں ان کی اچانک نگاہ پڑ گئی ہے)

یہ حادثہ بھی خوب ہوا ۔

(صوفے کی طرف جاتے ہیں اور چھڑی سے اس کے جلے ہوئے حصے کو چھیڑتے ہیں ۔
خانم خاموشی سے انہیں دیکھ رہی ہے)

خانم : آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں ؟

نیازی : میں کہتا ہوں کتنا معمولی واقعہ تھا ۔ راشدہ نے پلگ سے استری کا شو نہ نکالا اور تم کو بھی اس کا خیال نہ آیا ۔ حالانکہ استری سامنے صوفے پر پڑی تھی اور غالباً صاف طور پر دکھائی بھی دیتی ہوگی ۔

خانم : جو ہونا تھا وہ ہو چکا ۔

نیازی : (اپنے خیال میں) صوفے کو آگ لگ گئی ۔ آگ بڑھ بھی سکتی تھی ۔ دوسری چیزوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی ۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ

مستری نے دھواں دیکھ لیا ۔ مگر خانم (صوفے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے) ایک بات سمجھ میں نہیں آسکی ! ـــــ ادھر آؤ نا !

خانم : اب چھوڑیے اس کمبخت بات کو ۔

نیازی : اس واقعے کی اہمیت ہی کیا ہے ـــــ تاہم ـــــ

(خانم ذرا آگے بڑھتی ہے صوفے سے کچھ دور رہ کر رک جاتی ہے)

راشدہ نے استری صوفے کے درمیانی حصے میں رکھی ہوگی ۔ سب سے پہلے صوفے کو درمیان میں جانا چاہیے تھا ۔ لگتا ہے آگ اس کے ایک سرے سے لگی ہے ۔

خانم : تو ـــــ

نیازی : نہیں کوئی اہم چیز نہیں ۔ ممکن ہے راشدہ نے استری اس کے ایک سرے پر ہی رکھی ہو ۔ آدمی بے خیالی میں کیا کچھ نہیں کر دیتا اور سمجھتا ہے (مسکرا کر) اس نے باقاعدہ شو پلگ سے نکالا تھا اور استری کو تپائی کے اوپر رکھ دیا تھا ۔ راشدہ بھی سمجھتی ہے ۔ شو پلگ سے نہیں ہٹایا تھا ۔ اس وجہ سے آگ لگ گئی ۔ ہاں خانم ۔

خانم : کہیے !

نیازی : یہ صوفے پر دھبے کیسے ہیں ۔ لگتا ہے یہاں گھی

وغیرہ ڈالا گیا ہے ـــ مگر نہیں۔ گھی بھلا کس نے ڈالا ہوگا۔ پرانا صوفہ ہے۔ نہ جانے یہاں کون کون بیٹھا رہتا ہے اور بعض آدمی تو اتنی بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں کہ کھانا کھانے کے بعد چکنائی سے بھری ہوئی انگلیاں صوفے کی پشت سے صاف کر دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست کی یہی عادت تھی۔

خانم: بھائی جان! چائے

نیازی: شکریہ۔ میں بہت کم چائے پیتا ہوں اور

خانم: ہوں!

(نیازی صوفے کے لٹکے ہوئے کپڑے کو چھڑی سے چھونے لگتا ہے)

نیازی: یہ کپڑا یوں لٹک گیا ہے جیسے اسے نوچا گیا ہو۔

خانم: نوچا گیا ہو؟

نیازی: میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے ادھیڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خانم: آپ غلط کہہ رہے ہیں۔

نیازی: غلط ہی کہہ رہا ہوں گا۔ خیر ـــ جب لوگوں نے یہاں آ کر صوفے کو شعلوں میں گھرا ہوا دیکھا ہوگا تو نہ جانے آگ پر قابو پانے کے لئے کیا کچھ کیا ہوگا۔ کئی ہاتھ صوفے پر آ پڑے ہوں گے۔ پانی ڈالا ہوگا آگ پر ـــ اور خانم اس وقت استری

کہاں تھی ؟

خانم : تپائی پر ۔

نیازی : تپائی پر ۔ واہ استری سے صوفے کو آگ لگی اور استری تپائی پر تھی ۔

خانم : اب مہربانی کر کے اس قصے کو چھوڑیے !

نیازی : تم ابھی تک پریشان ہو ؟

خانم : آپ مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں ۔

نیازی : ہاں چھوڑیئے اس قصے کو۔۔۔ آپ پریشان ہو رہی ہیں اور مجھے بھلا اس سے کیا دلچسپی ہوگی ۔ آگ صوفے کو لگی یا لگائی گئی ۔

(خانم گھور کر نیازی کو دیکھتی ہے)

خانم : لگائی گئی ۔ کیا مطلب ؟

نیازی : میرا مطلب یہ نہیں تھا جو تم نے سمجھ لیا ہے ۔

خانم : میں نے کیا سمجھا ہے ۔

نیازی : تم نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ آگ کسی نے لگائی تھی ۔

خانم : یہی تو آپ نے کہا ہے ۔

نیازی : مگر میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ کسی نے اس پر گھی چھڑکا اور پھر ماچس جلا کر۔۔۔

خانم : بھائی جان آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں ؟

نیازی : میں نے کہا نہیں۔۔۔ کہ آگ لگ گئی یا۔۔۔ مگر

چھوڑیئے جو کچھ ہوا — ہو گیا ۔ آگ لگی تھی ! لگ گئی ۔

خانم : میں اوپر جانا چاہتی ہوں ۔

نیازی : ویسے تو میں تم کو روک نہیں سکتا ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس وقت پریشان ہو اور پریشانی میں آدمی کو تنہا نہیں ہونا چاہیے ۔

خانم : آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں ایسی باتیں کر کے ۔

نیازی : کیسی باتیں ؟

خانم : کہا نہیں آپ نے آگ لگائی گئی ہے ۔

نیازی : یہ فقرہ بے دھیانی میں منہ سے نکل گیا ہے ۔ آگ لگ گئی یا لگائی گئی ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔

خانم : کیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ؟

نیازی : خانم ! دیکھو نا نتیجہ یکساں ہوتا ہے دونوں کا ۔ یعنی صوفہ جل جاتا ہے ۔

خانم : میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ۔

نیازی : کہنا یہ چاہتا ہوں —— نہیں مجھے غلط فہمی ہے ۔

خانم : غلط فہمی کیسی ؟

نیازی : خانم !

خانم : فرمائیے !

نیازی : اب تمھاری طبیعت کچھ ٹھیک ہے نا !

خانم : میری طبیعت کو کیا ہے ۔ آپ صاف بات کیجیے ۔

نیازی : صاف بات !

(نیازی خانم کو غور سے دیکھتے ہیں)

خانم : کیوں صاف بات کیوں نہیں ۔ کہیے جو کہنا چاہتے ہیں ۔ کیا شک ہے آپ کے دل میں ۔

نیازی : میرے دل میں شک و شبہ کوئی نہیں ۔ تم نے جو کچھ کہا ہے درست ہے ۔

خانم : میں نے کیا کہا ہے ؟

نیازی : استری سے آگ لگ گئی !

خانم : تو اور کس طرح لگی ؟

نیازی : راشدہ کہتی ہے میں نے شو——

خانم : بار بار آپ یہ فقرہ کیوں دہراتے ہیں ۔ راشدہ نے یہ کہا تھا ۔ راشدہ نے وہ کہا تھا ۔

نیازی : کیا راشدہ نے کچھ اور بھی کہا تھا ؟

(خانم اس کا کچھ جواب نہیں دیتی ۔ نیازی سگار کے دو تین کش لیتے ہیں اور صوفے کے قریب جا کر اس پر جھک جاتے ہیں)

آج کل لوگ صوفوں پر پلاسٹک چڑھا دیتے ہیں لیکن آگ تو اس صورت میں بھی لگ سکتی ہے ۔ کتنا پرانا صوفہ ہے نہ جانے اس سے کیا کچھ وابستہ ہے ۔

(خانم تڑپ کر آگے بڑھتی ہے اور بڑی تیزی سے نیازی کو مخاطب کرتی ہے)

خانم : میں کہتی ہوں ـــ جو کچھ کہنا چاہتے ہو!
کہہ دو ـــ کہہ دو ۔ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ
آگ لگی نہیں لگائی گئی ہے اور تم نے لگائی ہے ۔ یہی
کہنا چاہتے ہو نا ۔

(نیازی بڑے مطمئن انداز میں سگار کے کش لینے
لگتے ہیں)

چپ کیوں ہو گئے ہو ؟

نیازی : خانم ۔

خانم : بڑے آئے ہمدرد بن کر ـــ مجھے معلوم نہ تھا اتنے
ستم ظریف ہو ۔

نیازی : پتا نہیں میں کیا ہوں ۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں
کہ حقیقت پردوں کے پیچھے پوشیدہ نہ رہے ۔
سامنے آ جائے ۔ حقیقت تاویلات کے پردوں میں چھپ
جاتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے اور شاید تمھیں
بھی ـــ

خانم : کیا چھپا ہے ـــ کیا چھپایا گیا ہے ۔

نیازی : مجھے بہت افسوس ہے خانم ! میری باتوں سے تمھیں
دکھ ہوا ۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ برداشت
نہیں کر سکتا کہ میری عزیز جان میری طرف سے
شاکی ہو ۔

خانم : آپ کیوں ایسی گفتگو کر رہے ہیں ؟

نیازی : اب نہیں کروں گا ۔

خانم : خدا کی پناہ! ۔ آپ چائے پئیں گے نا ۔

نیازی : نہیں خانم!

(خانم سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

اور خانم ۔

(خانم سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتی ہے)

اب میں جاؤں ؟

خانم : اچھا ـــــ خدا حافظ ۔

نیازی : (دالان والے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) میرا خیال ہے میں اسے بھی لے جاؤں گا ۔

خانم : کسے ؟

نیازی : (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) اس کی وجہ سے تمھیں شکایت کا موقع ملا ہے ۔ یہ نہ یہاں رہے گا اور نہ آئندہ اس کے بارے میں بات چیت ہوگی ۔

خانم : نہیں ۔

(نیازی جاتے جاتے رک جاتے ہیں)

نیازی : نہیں ۔ تم اس حالت میں بھی اسے جدا کرنا نہیں چاہتیں ۔ حالانکہ اسے تلف کر دینا چاہتی تھیں ۔

خانم : (گھور کر دیکھتے ہوئے) بھائی جان ۔

نیازی : میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے جلا کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا ۔

خانم : کیوں ؟

نیازی : جو کام تم نہیں کر سکیں اس کی تکمیل میرے ہاتھوں ہو جائے تو کیا حرج ہے ؟

خانم : تم ظالم ہو ، بے درد ہو ۔

نیازی : مجھے اپنی ذات کے متعلق یہ علم نہیں تھا ـــــ مگر سچائی شاید یہ نہیں ۔

(خانم دو تین لمحے خاموش رہ کر نیازی کو گھورتی رہتی ہے اور پھر بازوؤں میں اپنا سر چھپا کر رونے لگتی ہے ۔ نیازی اس کی طرف دیکھتے ہیں اور ادھر بڑھتے ہیں)

خانم : نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے ! اگر تم اس معاملے میں خاموش رہنا چاہتی ہو تو میں ایک لمحہ توقف کئے بغیر چلا جاتا ہوں اور پھر کبھی اس سلسلے میں ایک حرف تک زبان پر نہیں لاؤں گا ۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے مجھے اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے ۔ مگر میں ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ یہ صوفہ یہاں نہیں رہنا چاہیے ۔ اس نے اپنے جلے ہوئے بازوؤں میں تمہیں جکڑ رکھا ہے ۔ میں جو کہتا ہوں اسے پوری طرح تلف کر دوں گا تو کسی خاص وجہ سے ہی کہتا ہوں ۔ شاید تم خود تلف نہیں کر سکتیں ۔

خانم : (سر اٹھاتے ہوئے) نہیں ۔

نیازی : خانم ! کیا اس کے ساتھ کوئی تلخ یاد وابستہ ھے ۔

(خانم پھر سر چھپا لیتی ھے)

دنیا میں بعض چیزوں کے ساتھ ہماری بڑی تلخ یادیں وابستہ ھو جاتی ھیں اور ھم چاھتے ھیں کہ ان کا وجود ھی ختم ھو جائے ۔

خانم : (اسی حالت میں) آپ جانتے ھیں ۔

نیازی : کیا ؟

خانم : آپ کو خبر ھے ۔

(خانم سر اٹھاتی ھے ۔ نیازی اس کی طرف نہیں دیکھتے ۔ نگاھیں جھکائے رکھتے ھیں)

نیازی : کیا خبر ؟

خانم : رشید میرا بچپن کا ساتھی تھا ۔

(نیازی اثبات میں سر ھلاتے ھیں)

ھم کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے ۔

نیازی : مجھ سے یہ بات کس طرح پوشیدہ رہ سکتی تھی ؟

خانم : ھم دونوں سمجھتے تھے ــــ

نیازی : تمھیں یہ بات سمجھنے کا حق پہنچتا تھا ۔

خانم : مگر ابا اور امی اس رشتے کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ ان کی نظر امی کے بھانجے پر تھی ۔

نیازی : یوسف پر ۔ میں جانتا ھوں ۔

خانم : اور اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ میری شادی یوسف سے

ہو گئی ۔

نیازی: ہوں ۔

خانم: شادی کے بعد مجھے ڈر تھا کہ رشید مجھ سے ملنے کے لیے آیا کرے گا اور اس سے ہمارے گھریلو معاملات میں پیچیدگی اور تلخی پیدا ہو جائے گی ۔ کیا خبر یوسف کو اس کا علم ہو ۔

نیازی: جہاں تک میں سمجھتا ہوں یوسف کو اس کا علم تھا ۔

خانم: میں نے چاہا کہ رشید کو ایک خط لکھ کر بتا دوں کہ اب میرا اور اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ وہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھے ۔ میں اب ایک بیاہتا عورت ہوں ـــ اور بیاہتا عورت کا فرض یہ ہے کہ ـــ

نیازی: (جلدی سے) ٹھیک سوچا تھا تم نے ۔

خانم: میں نے خط لکھ کر لفافے میں بند کر دیا ۔ لفافے پر رشید کا پتہ لکھا اور اٹھنے ہی والی تھی کہ سامنے کے کمرے سے یوسف کے قدموں کی آہٹ سنائی دی ۔

نیازی: اچھا ۔

خانم: مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا ۔ جلدی سے لفافہ کہیں صوفے میں چھپا دیا ۔

نیازی : اس وقت تم صوفے پر بیٹھ کر خط لکھ رہی تھیں !

خانم : میں نے یوسف کو کھانا کھلایا ۔ کھانے کے بعد اس نے اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں ۔ شام کو مہمان آگئے ۔ صبح بھی مہمانوں کا ہنگامہ رہا ۔ شام کے قریب مجھے تنہائی کا موقعہ ملا ۔ لفافہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر نہ جانے اسے کہاں رکھ دیا تھا ۔ مل ہی نہ سکا ۔

نیازی : مل ہی نہ سکا !

خانم : جی ! سوچتی تھی کہ اسے ادھیڑ دوں ۔ لیکن کیسے گھر والے کیا کہیں گے ـــ کیا ہو گیا ہے اس عورت کو ۔ صوفہ ادھیڑ رہی ہے ۔ ایک بار اور کوشش کی ۔ لفافہ نہ ملنا تھا ، نہ ملا ۔ کچھ دن تک میں شک ، تذبذب اور بد گمانی کی سی کیفیت میں یوسف کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتی رہی ۔ ان کے طور طریقے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ پہلے کی طرح بہت اچھے شوہر تھے ۔ گھر میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کے سلوک میں کوئی تبدیلی محسوس ہوتی ۔

نیازی : سب کچھ ٹھیک تھا ۔

خانم : جی ہاں کچھ مدت بعد ڈرائینگ روم کے لیے

نیا صوفہ سیٹ خریدا گیا تو اسے اٹھوا کر پچھلے کمرے میں رکھوا دیا گیا ۔ جہاں یہ نظروں سے دور رہتا تھا یہ واقعہ بھول گیا مجھے !

نیازی : یہ لفافے والا واقعہ ؟

خانم : ہاں ! پھر ہم اس مکان میں منتقل ہو گئے اور اس کے لیے بیشتر نیا فرنیچر خریدا گیا ۔

نیازی : اور اس صوفے کو کسی نے نہ چھیڑا ۔

خانم : گودام میں بھجوا دیا گیا ۔

نیازی : پھر ؟

خانم : چند روز ہوئے راشدہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ مجھے بتائے بغیر گودام سے یہ صوفہ اٹھوا لائی ۔

نیازی : ظاہر ہے اسے دیکھ کر تمہاری پرانی یاد تازہ ہو گئی ہوگی ۔

خانم : جی !

نیازی : تم نے لفافہ ڈھونڈا ہوگا ۔

خانم : کیوں نہیں ؟

نیازی : نہیں ملا ۔ پھر بھی تمہارا یہی احساس رہا کہ وہ اس کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے اور تم نے اسے تلف کر دینا چاہا ۔

خانم : مجبوری تھی ۔

نیازی : میں یہ مجبوری سمجھتا ہوں -

خانم : کیا کر سکتی تھی ؟

(نیازی منہ پھیر کر نیا سگار جیب سے نکالتے ہیں - پہلا ادھ جلا سگار تپائی کے پاس جا کر ایش ٹرے میں ڈال دیتے ہیں -

لائٹر سے سگار جلاتے ہیں -

خانم انہیں بڑے غور سے دیکھ رہی ہے)

نیازی : نہیں اب ایسا نہیں ہوگا (مسکرا کر) میں لائٹر اپنی جیب میں ڈال رہا ہوں -

(خانم خاموش کھڑی ہے)

مگر خانم انسان اتنا مجبور کیوں ہو جاتا ہے -

(خانم خاموش ہے)

ذرا سوچو - اگر اس زمانے میں تمہارا لفافہ اس صوفے سے مل جاتا تو تمہارا رویہ کیا ہوتا - تم کہتیں کتنا ہمدرد صوفہ ہے میرا راز اس نے چھپا کر رکھا ہے اور پھر شاید تم کبھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں -

خانم : آپ میری مجبوری نہیں سمجھ سکتے -

نیازی : کیسے نہیں سمجھ سکتا ؟ وہ تو میں نے ویسے ہی انسانی مجبوری کا ذکر کیا ہے - انسان تو انسان ہے بے جان چیز بھی مجبور ہو جاتی ہیں تمہاری مجبوری

یہ تھی کہ تم نے لفافے کو صوفے کے اندر چھپا ہوا محسوس کیا اور صوفے کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ہر معاملے میں مجبور تھا ۔

خانم : ہر معاملے میں مجبور ۔ کیا مطلب !

نیازی : اگر تمہاری بجائے کوئی اور ہاتھ بڑھا کر لفافہ نکال لیتا تو صوفہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا ۔

خانم : کیا ؟ کس نے اپنا ہاتھ بڑھایا ـــ کس نے لفافہ نکالا ؟

نیازی : مثلاً ـــ تمہارے شوہر نے ۔

خانم : (تڑپ کر) یوسف نے ؟ ـــ آپ

نیازی : تمہارے کانوں نے اس کے پاؤں کی آہٹ سنی تھی اور اس کی نگاہوں نے تمہیں لفافہ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا ۔

خانم : نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ! ! ! آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں ۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں ـــ ایسا نہیں ہوا ـــ ایسا نہیں ہوا ! ! !

نیازی : خانم ! آخر اس میں غیر امکانی واقعہ کیا ہے ۔ تم سمجھتی ہو ۔ یوسف کے ہاتھ لفافہ لگ جاتا تو تمہارے خیال میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ۔ میں نہیں سمجھ سکتا اس میں ہنگامہ برپا کرنے کی کیا ضرورت

تھی یوسف مرحوم کے ساتھ بہ حیثیت بیوی کے تم نے ایک مدت گزاری ہے ۔ تم نے اندازہ نہیں لگایا کہ وہ ایک خاموش طبع انسان تھا اور عقلمند بھی تھا ۔ اور پھر خانم تم نے اس لفافے میں لکھا بھی کیا تھا ۔

خانم : آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں !

نیازی : میری باتیں کچھ پیچیدہ تو نہیں ہیں ۔

خانم : میں نہیں سمجھ سکتی !

نیازی : ایک بات تمھیں معلوم ہو جائے تو غالباً سب کچھ سمجھ جاؤ گی ۔

خانم : کونسی بات ۔

نیازی : میں نے کہا ہے نا یوسف ایک عقلمند آدمی تھا ۔ وہ لفافہ میرے پاس لے آیا ۔

خانم : آپ کے پاس !

نیازی : میں نے تحریر پڑھی ۔۔۔ اور اس سے کہا ۔ یوسف تم ایک خوش قسمت شوہر ہو ۔ یہ تحریر پھاڑ ڈالو ، لفافہ پوسٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ رشید ہمیشہ کے لیے کراچی جا رہا ہے اور یہ بھول جاؤ کہ یہ تمھیں کہاں سے ملا اور کیونکر ملا ؟ اس نے وعدہ کر لیا اور اس نے یہ وعدہ کس طرح نبھایا ۔ تم جانتی ہو !

خانم : (مطمئن لہجے میں) جانتی ہوں ۔

نیازی : لو بھئی اب ہم چلیں گے ۔ مسکرا کر اتنی سی بات تھی جیسے افسانہ کر دیا ۔ (صوفے کی طرف دیکھ کر ، بے چارہ صوفہ) اس کائنات میں کتنی مجبوریاں ہیں انسان کو ؟

خانم : رکئے گا نہیں ؟

نیازی : نہیں خانم ! میں بھی شام کے وقت گھومنے کا عادی ہوں ۔ کچھ دیر گھوم کر جاؤں گا ! خدا حافظ ۔

(نیازی دالان والے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتے ہیں اور پھر دروازے میں سے نکل جاتے ہیں ۔

خانم جو وہیں کھڑی ہے ۔ سر کو جھٹکا دیتی ہے اور ٹہلنا شروع کر دیتی ہے ۔

چار پانچ لمحوں کے بعد راشد اور اکرم کے قہقہوں کی آواز باہر سے آتی ہے ۔

خانم رک کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے ۔ راشدہ اور اکرم آتے ہیں ۔

راشدہ اندر آتے ہی اپنا کوٹ اتارنے لگتی ہے ،

راشدہ : امی ! چچا جان اپنا لائٹر بھول گئے تھے ۔

خانم : ہاں ۔

اکرم : دروازے کے سامنے ہی مل گئے ۔

راشدہ : میں نے کہا اب کھانا کھا کر ہی جائیے ۔

کہنے لگے نہیں مجھے سیر کرنی ہے ۔

خانم : کھانے کا بندوبست تو ابھی ہوا ہی نہیں ۔ جاتی ہوں ۔

راشدہ : اسی میں بھی آتی ہوں اوپر ۔ ابھی ایک منٹ میں ۔

خانم دالان والے دروازے میں سے نکل جاتی ہے ۔

راشدہ کوٹ ہاتھ میں اٹھائے صوفے والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے ۔ صوفے کے پاس جا کر رک جاتی ہے ۔

تو آپ ! صبح اسے اٹھوا کر لے جائیں گے نا فرنیچر ہاؤس میں ۔ وہ لوگ بالکل نیا بنا دیں گے !

اکرم : بہت پرانا نہیں ہو چکا تھا ۔

راشدہ : واہ — پرانا کیا ہو چکا ہے ۔ تم تو بھول ہی گئے ۔

(اکرم بیوی کی طرف جانے لگتا ہے)

یاد نہیں بچپن میں اس پر چڑھ کر چھلانگیں لگایا کرتے تھے ۔ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اس پر بیٹھا کرتے تھے ۔ مجھے تو بہت پیارا لگتا ہے یہ ۔ بہت پیارا ہائے جل گیا ۔ خیر ۔ ٹھیک ہو جائے گا ۔

(شوہر کو پیار کی نظروں سے دیکھتی ہے دونوں دو تین لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں ۔ اور اسی عالم میں پردہ گرتا ہے ۔

یرزا ادیب ۴ ۔ اپریل ۱۹۱۴ء میں بہ مقام لاہور پیدا ہوئے ۔ اسلامیہ کالج
لاہور سے ۱۹۳۶ء میں بی اے (آنرز) کیا ۔ سترہ سال بطور مدیر اعلیٰ
اہنامہ ادب لطیف سے منسلک رہے آجکل ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں ۔
چھ مجموعے ڈراموں کے شائع ہو چکے ہیں ۔ چار افسانوی مجموعوں ،
یک تنقیدی کتاب اور ڈیڑھ درجن کے قریب بچوں کی کتابوں کے مصنف ۔
علاوہ ازیں پندرہ کتابوں کے مولف بھی ہیں ۔
پ کے افسانوں کے ایک مجموعے کا حال ہی میں روسی زبان میں ترجمہ
ہوا ہے جسے ماسکو میں شائع کیا گیا ہے ۔
وجودہ کتاب ''پس پردہ'' پر ۱۹۶۷ء کا آدم جی انعام ملا ہے ۔

(ناشر)